BAUL(N) - 220

بی.اے.اُردو

سمسٹرسوم

BACHELOR OF ARTS (URDU)

THIRD SEMESTER

MINOR

اردو ادب کی تاریخ–I

URDU ADAB KI TAREEKH - I

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی.اے.اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر سوم

THIRD SEMESTER

بی.اے. یو.ایل (این.) - ۲۲۰ - اردو ادب کی تاریخ-۱

BAUL(N) - 220, URDU ADAB KI TAREEKH - I

MINOR

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی.اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، اُردو ادب کی تاریخ-۱ کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی وَرسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے.اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بی.اے.اردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، اردو ادب کی تاریخ-ا کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۱۲/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا وطالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو{خود تدریسی مواد{SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض ومقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو

(B.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹرسوم

THIRD SEMESTER

بی.اے. یو.ایل(این.) - ۲۲۰ - اردوادب کی تاریخ-ا

BAUL(N) - 220, URDU ADAB KI TAREEKH - I

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	
بلاک نمبر 01:			6
اِکائی 1	زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا	محمد سالم	7
اِکائی 2	مغربی ہندی کی بولیاں	محمد افضل حُسین	22
اِکائی 3	شمالی ہنداور دکن میں اردوادب کا آغاز	محمد افضل حُسین	29
اِکائی 4	اردوزبان وادب کا ابتدائی زمانہ	ڈاکٹرنعیم انیس	38
اِکائی 5	اُردوزبان کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات	محمد افضل حُسین	52
بلاک نمبر 02:			61
اِکائی 6	بہمنی عہد میں اُردوادب	محمد سالم	62
اِکائی 7	قطب شاہی عہد میں اردوادب	محمد افضل حُسین	79
اِکائی 8	عادل شاہی عہد میں اردوادب	محمد افضل حُسین	90
اِکائی 9	ولؔی اور سراؔج کا دَور	غلام جیلانی	100

بلاک نمبر 03:		**120**
اِکائی **10** اُردو ادب کا سنہرا دَور	ڈاکٹر نعیم انیس	121
اِکائی **11** اُردو ادب کا عہدِ جدید	ڈاکٹر اختر علی	136
اِکائی **12** نظیر اکبرآبادی کا دَور	غلام جیلانی	148

✵

بلاک نمبر 01

اکائی 01	زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا	محمد سالم
اکائی 02	مغربی ہندی کی بولیاں	محمد افضل حُسین
اکائی 03	شمالی ہند اور دکن میں اردو ادب کا آغاز	محمد افضل حُسین
اکائی 04	اُردو زبان وادب کا ابتدائی زمانہ	ڈاکٹر نعیم انیس
اکائی 05	اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات	محمد افضل حُسین

اکائی 01 : زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : زبان کی تعریف

01.04 : زبان اور بولی میں فرق

01.05 : ہند آریائی کا ارتقا

01.06 : ہند آیائی کے متعلق ماہرین کے نظریات

01.07 : قدیم ہند آریائی

01.08 : وسطی ہند آریائی

01.09 : ہند آریائی کا جدید دور

01.10 : مغربی ہندی

01.11 : خلاصہ

01.12 : فرہنگ

01.13 : نمونہ امتحانی سوالات

01.14 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ درج ذیل چیزوں کا مطالعہ حاصل کریں گے :

زبان کسے کہتے ہیں اور زبان کس طرح وجود میں آتی ہے؟ بولی کسے کہتے ہیں اور بولی زبان سے کس طرح سے مختلف ہے؟ ہند آریائی کا ارتقا کیسے ہوا؟ مغربی ہندی کی بولیاں کونسی ہیں؟ پراکرت کسے کہتے ہیں؟ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں اور اسکی کتنی اقسام ہیں؟

01.02 تمہید

انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ زبان ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں نطق پایا جاتا ہے۔ نطق سے مراد وہ انسانی جوہر ہے جس کی مدد سے انسان میں بولنے اور بات چیت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ زبان انسان کی معاشرتی وسماجی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر وجود میں آئی۔ زبان کب وجود میں آئی؟ اس کا تعین کرنا مشکل وپیچیدہ کام ہے۔ زبان بامعنی، آوازوں کے مجموعے کا نام ہے۔ زبان وہ آلہ کار ہے جس کی مدد سے ہم بول کر، لکھ کر یا اشاروں کے ذریعہ اپنے احساسات

اور خیالات کا اظہار بہت آسانی سے کر پاتے ہیں۔ عام طور پر ہم بول کر یا لکھ کر ہی اپنی بات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اشارات و کنایات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

''ابھی تک یقینی طور پر یہ بات طے نہیں ہوئی کہ انسان سب سے پہلے کہاں پیدا ہوا اور کس زبان میں انہوں نے ابتدا میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ اکثر علما نے تو کہہ دیا کہ زبان کی ابتدا کا سراغ لگانا اندھرے میں ٹٹولنا ہے اور اندھرے میں ٹٹولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

زبان جہاں بھی پیدا ہوئی ہو اور اسکی نشونما کی جو بھی نوعیت رہی ہو لیکن ایک بات طے ہے انسان نے ہر دور میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کوئی نا کوئی طریقہ ضرور ایجاد کر رکھا تھا اب وہ تصاویر کی صورت میں ہو یا پھر کسی اور شکل میں۔

زبان کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ اول: زبان کی ظاہری صورت دوم: اس کی معنوی صورت۔ اگر کوئی آواز اپنی معنوی حیثیت کو الفاظ کے ذریعے کلی طور پر ادا نہ کر سکے تو اس زبان کا مقصدِ اصلی یعنی ترسیل و ابلاغ کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ الفاظ و معانی میں ربط و تعلق کا پایا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ الفاظ و معانی میں ربط و تعلق سے ہی زبان کا حسن برقرار رہتا ہے۔

دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ان تبدیلیوں سے مختلف بولیاں جنم لیتی ہیں۔ زبان اور بولی میں فرق ہوتا ہے۔ زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جبکہ بولی کا دائرہ ایک چھوٹے سے خطے تک محدود رہتا ہے۔

زبان ایک ایسا وسیلہ ہے کہ جس کی مدد سے اپنی بات اور جذبات کو تقریری و تحریری شکل میں لوگوں تک آسانی سے پہونچایا جا سکتا ہے۔ زبان و مکان کے اعتبار سے زبانیں منفرد خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہوتی ہیں اسی وجہ سے زبانوں کے مختلف خاندان پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں بولے جانے والی تمام بولیوں کی نسلی بنیادوں پر درجہ بندی کرنے سے کل سات لسانی خاندان معرض وجود میں آتے ہے لیکن اردو زبان سے مناسبت کی بنا پر ماہرین لسانیات مندرجہ ذیل چار لسانی خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿۱﴾ ہند یورپی خاندان (Indo-European)

﴿۲﴾ چینی تبتی خاندان (Sino-Tibetan)

﴿۳﴾ افریقی ایشائی خاندان (Afro-Asiatic)

﴿۴﴾ دراوڑی خاندان (Dravidian)

دنیا کے مختلف خاندانوں میں ہند یورپی خاندان کو خصوصیات کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہند یورپی زبان ہند ایرانی کی منازل طے کرتے ہوئے ہند آریائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہند آریائی زبان کا ارتقا مندرجہ ذیل تین اَدوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

﴿۱﴾ قدیم ہند آرایائی (۱۵۰۰ق م تا ۵۰۰ق م)

﴿۲﴾ وسطی ہند آرایائی (۵۰۰ق م تا ۱۰۰۰عیسوی)

﴿۳﴾ جدید ہند آرایائی (۱۰۰۰عیسوی تا حال)

01.03 زبان کی تعریف

ماہر لسانیات عبدالقادر سروری اپنی کتاب زبان اور علم زبان میں زبان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''زبان، لسانیات کی اصطلاح میں، وہ ملفوظ آوازیں ہیں، جو انسان اپنے منھ سے ادا کرتا ہے اور جن کے ذریعے سے وہ اپنے مافی الضمیر کو دوسرں پر ظاہر کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان آوازوں کو جب ہم حروف کی مدد سے قلم بند کر دیتے ہیں، تو ایسی قلم بند کی ہوئی تحریروں کو بھی زبان کا نام دیا جاتا ہے۔''

خلیل صدیقی اپنی کتاب زبان کیا ہے میں تحریر کرتے ہیں۔ زبان، انسان کی تکلمی یا نقتی آوازوں سے تشکیل پاتی ہیں۔ زبان علامتی حیثیت رکھتی ہے۔ اختیاری یا متفق الیہ ہوتی ہے۔ یہ ایک نظام ہے۔ ابلاغ کا اہم ذریعہ بنتی ہے۔ ماہرین لسانیات نے زبان کی متعدد خصوصیات کے پیش نظر مختلف تعریفات کی ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے زبان کی تعریف اس انداز میں کی ہے:

''زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دوہرا سکتا ہے۔''

(عام لسانیات ص/۲۵، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ)

بابائے اردو مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں:

''زبان بھی ایک انسانی عمل ہے۔ اس کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف تو یہ عمل اس شخص کی طرف سے ہے جو اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی جانب سے ہے جو دوسروں کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی زبان خیالات کے ساتھ ساتھ جذبے کی ترسیل کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔''

پروفیسر نصیر احمد خان زبان سے متعلق رقمطراز ہیں:

''زبان بنیادی طور پر انسان کے علامتی عمل کی ایک انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ زبان کی علامتیں آوازوں سے عبارت ہیں، جو ہمارے اعضائے صوت کے مختلف انداز میں عمل پیرا ہونے سے تلفظ ہوتی ہیں۔ جب یہ آوازیں مختلف کلاسوں اور سلسلوں میں ترتیب پاتی ہیں تو ایک پیچیدہ اور منظّم ساخت وجود میں آتی ہے۔ زبان کی حقیقت یا اس کا وجود ان علامتوں پر منحصر ہوتا ہے جو بامعنی ہوتی ہیں۔ علامت اور جس چیز کے لیے وہ مخصوص ہے اس کے درمیان تعلق محض اختیاری ہوتا ہے یعنی سماج کے ذریعہ یہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ زبان کی ساخت اور حقیقت میں بلا کا تنوع ہوتا ہے جس کی مدد سے ہم اپنے کسی بھی خیال، تجربے، احساس یا فکر کو با آسانی پیش کر سکتے ہیں۔''

(ص ۲۱، ۳۱، اردو کی بولیاں اور کرخنداری)

پروفیسر احتشام حسین زبان کی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں:

''یہ بتانا تو مشکل ہے کہ زبان کسے کہتے ہیں لیکن سمجھنے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں کے معنی معین کرتے گئے ہیں تا کہ کہنے اور سننے والے کے یہاں ایک لفظ سے تقریباً ایک ہی جذبہ پیدا ہو۔ الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامتیں ہیں جنہیں ہم دوسروں کے ذہن تک پہنچانا چاہتے ہیں۔''

(ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۲۰-۱۹، پروفیسر احتشام حسین)

01.04 زبان اور بولی میں فرق

زبان کسی ملک اور سماج کے افراد کے ذریعہ احساسات وخیالات کی ترسیل کے لیے استعمال کیے جانے والے ایک نظام کا نام ہے۔ زبان کو زمانہ قدیم سے لے کر اب تک ذرائع ابلاغ کے روپ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ کسی بھی زبان کے عام طور پر دو پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا۔تحریری دوسرا۔تقریری

دنیا میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ بہت ساری زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے ہندی، انگریزی، عربی، فارسی، فرینچ، جرمن، وغیرہ عالمی زبانوں کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں جبکہ مراٹھی، گجراتی، چھتیس گڑھی، آسامی، پنجابی، بہاری وغیرہ ملکی زبانوں کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔

کسی ایک علاقے میں آپس میں مشابہت رکھنے والی کئی بولیاں بولی جاتی ہیں انہیں بولیوں میں سے کسی ایک بولی کو عوام الناس اپنی خاص توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں جو آگے چل کر زبان کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ زبان کسی مستقل چیز کا نام نہیں بلکہ اس میں زمان ومکان کے اعتبار سے تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے عوام کسی بولی کو استعمال میں لاتے رہتے ہیں اس کا معیار قائم ہوتا جاتا ہے۔

بولی کو انگریزی میں **Dialect** کہا جاتا ہے۔ بولی وہ مقامی زبان ہے جس میں عام طور پر لوگ بات چیت کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے قواعد نہیں۔ چنانچہ ایک ہی خطے کی بولی میں فرق ہوتا ہے۔ زبان کا علاقہ وسیع وعریض ہوتا ہے جبکہ بولی ایک مخصوص اور چھوٹے سے خطے میں بولی جاتی ہے۔ ایک علاقے میں کئی بولیاں ہو سکتی ہے جبکہ زبان ایک ہی ہوتی ہے۔

زبان اور بولی کے فرق کو مندرجہ ذیل نقشے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

زبان اور بولی میں فرق کی مزید معلومات درج ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زبان	بولی
زبان میں ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔	بولی میں ادب کا فقدان ہوتا ہے۔
یہ وسیع وعریض علاقے میں بولی جاتی ہے۔	یہ کسی چھوٹے علاقے تک ہی محدود ہوتی ہے۔
کسی ایک زبان میں کئی بولیاں شامل ہو سکتی ہے۔	زبان کو بولی میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

زبان تحریری وتقریری دونوں قسم کی ہوتی ہے۔	بولی صرف تقریری ہوتی ہے۔
زبان کا استعمال ہر جگہ مفید ہے۔	بولی کا استعمال ایک محدود خطے تک ہی کیا جا سکتا ہے۔
زبان گرامر کے اصول وضوابط پر مبنی ہوتی ہے۔	بولی کی کوئی خاص گرامر نہیں ہوتی ہے۔
زبان میں وسعت و یکسانیت پائی جاتی ہے۔	بولی میں باہم بہت فرق ہوتا ہے۔
دو زبانوں کو انکی، رسم الخط، الفاظ کے ذریعے فرق کیا جاتا ہے۔	جبکہ دو بولیوں میں صرف تلفظ کے ذریعے ہی فرق کیا جاتا ہے۔
عربی، فارسی، اردو، انگریزی، گجراتی، پنجابی وغیرہ زبانیں ہیں۔	کھڑی بولی، ہریانوی، برج، قنوجی، بندیلی یہ سب بولیاں ہیں۔

01.05 ہندآریائی کا ارتقا

ہندوستان میں ہندیورپی زبانوں کا سلسلہ تقریباً ۳۵۰۰ ق۔م سے ملتا ہے۔ ہندیورپی زبانیں ترقی کرتی ہوئی جب اپنی دوسری منزل میں قدم رکھا تو انہیں ہندایرانی زبان کا نام دیا گیا۔ ہندیورپی زبانوں میں ادب اور دونوں حیثیتوں سے ہندایرانی کو سب سے قدیم اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ ہندایرانی نے ترقی پاکر تین شکلیں اختیار کرلیں۔ اس کا جو گروہ ایران میں مقیم رہا اس سے موجودہ ایرانی زبان کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض افراد ہجرت کرکے کشمیر اور اسکے قرب وجوار میں رہائش پزیر ہوئے انکی زبان پشاچی زبان کہلائی ہے۔

جب آریوں کا ایک بڑا گروہ بہت بڑی تعداد میں اپنے لسانی وِرثے کے ساتھ ہندوستان میں تشریف لے کر آیا یہیں سے ہندآریائی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ موجودہ ہندوستانی زبانوں کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے جس میں ایک زبان ہماری اردو بھی ہے۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن اور ہندوستان میں انکی آمد کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔ اکثر ماہرین لسانیات اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ تھے دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گیے تھے۔ جہاں بھی گیے کسی ایک منظّم شکل میں قیام پزیر نہیں ہوئے بلکہ تلاش معاش میں جہاں جگہ میسر ہوئی وہیں سکونت اختیار کرلی۔ قدیم کتابوں میں اس بات کے بھی بین ثبوت موجود ہیں کہ یہ لوگ ملک تبت سے آئے تھے۔ چند سنسکرت کے عالموں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے آریا یہیں کے باشندے تھے جو بعد میں ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔

اکثر محققین کی تعداد اس بات پر متفق ہے کہ آریوں کا اصل وطن وسطی ایشیا ہے۔ یہ لوگ جنوب مشرقی روس کے علاقے سے چل کر عراق، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لے کر آئے۔

01.06 ہندآیائی کے متعلق ماہرین کے نظریات

ہندآیائی کی ابتدا کے متعلق پروفیسر احتشام رقمطراز ہیں:

> ''ہندوستان میں ہندآریائی کے ارتقا کی داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ آریوں کے ابتدائی وطن، مختلف خطہ ہائے زمین پر ان کے داخلے، دوسری نسلوں اور قوموں سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور ان کی سیر وسفر کی زمانی اور مکانی صورت حال کا صحیح علم نہ ہو جائے۔ جہاں تک ہندآریائی کے ارتقائے مابعد کا تعلق ہے، ان باتوں کا علم بھی ضروری ہے کہ جس وقت آریہ ہندوستان میں آئے، اس وقت

ان کی زبان یا بولیاں ارتقاء کی کس منزل پر تھیں۔ ہندوستان میں کون کون سی قومیں آباد تھیں اور کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں۔''

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں آریا وسطی ایشیا میں آباد تھے۔ پھر انہوں نے ایشیا کوچک کو جو اب ٹرکی کا حصہ ہے، کو اپنا وطن بنایا۔ پھر وہاں سے نقل مکانی کر کے جنوب مشرق کی جانب چل کر یہ لوگ ۲۵۰۰ ق۔م میں ایران پہنچے، اور ۱۵۰۰ ق۔م میں ہندوستان کے شمال مغربی خطے پنجاب میں وارد ہوئے دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آریا آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور پنجاب میں مقیم ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ یہاں سے مشرق کی جانب بڑھتے گئے اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ انکی بول چال اور زبان میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ آریوں کے متعلق اکثر ماہرین ومحققین میں اختلاف رائے ہے۔

میکسمولتر رقم تراز ہیں:

''آریوں نے ڈراوڑی مذہب سے بہت سے عناصر قبول کر لئے بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیو مالا کچھ کھانے پینے کی چیزیں پان سپاری، لباس میں دھوتی یہ سب خالص ڈراوڑی عناصر ہیں۔ ان زبانوں کا ہند آریائی زبان کے قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان ہند آریائی مرحلے سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں ہند آریائی کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔''

﴿۱﴾ قدیم ہند آریائی ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م

﴿۲﴾ وسطی ہند آریائی ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء

﴿۳﴾ جدید ہند آریائی ۱۰۰۰ تا حال

01.07 قدیم ہند آریائی (۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م)

اس دور میں وِیدک اور سنسکرت زبان کا رواج عام تھا۔ جو دراصل سنسکرت کی قدیم شکل کا عہد ہے۔ اس دور میں چاروں ویدوں۔ رگ وید۔ سام وید۔ یجر وید۔ اتھر وید۔ ملتے ہیں۔ ہر قسم کے علمی اور مذہبی مطالعے میں سنسکرت کی بڑی اہمیت تھی۔ اس میں بڑے بڑے علما موجود تھے۔ قدیم سنسکرت پر آریوں کی آمد کا بڑا اثر پڑا جس وجہ سے سنسکرت کے تین شکلیں نکل کر آئی۔ اس کا قدیم ترین روپ وہ ہے کہ جب آریا پنجاب کے راستے سے داخل ہو کر شمال کے اکثر حصوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ وسرا روپ سنسکرت کی وسطی بولی کا ہے جب آریا مدھیا دیش تک پہونچ گئے۔ تیسرا روپ مشرقی بولی کا روپ ہے جب آریا مشرقی ہند تک پہونچ چکے تھے۔ ان علاقوں کی زبانیں بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کھو رہی ہیں۔ مغربی ہندوستان کے آریا انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اَسوروں کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی زبان کو براہمنہ میں اَشدھ کہا گیا ہے۔ اس عہد کی بولیوں میں سنسکرت کے الفاظ کا تلفظ مقامی اثر سے بدل گیا تھا اور دراوڑی الفاظ خاصی تعداد میں شامل ہو گئے ہیں۔ سنسکرت کی اس شکست وریخت کو دیکھتے ہوئے زبان کو نئے سرے سے منظّم ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے اور یہ ٹکسالی زبان سنسکرت ہے۔ ادبی سنسکرت کے سب سے پہلے جھلک ہمیں براہمنوں، اُپنشدوں اور سوتروں میں ملتی ہے۔ ابتدا میں لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس کے معانی صاف اور شستہ زبان کے ہیں، رفتہ رفتہ سنسکرت ایک زبان کا نام ہو گیا۔

01.08 وسطی ہند آریائی (۵۰۰ق م تا ۱۰۰۰ء)

ماہرین نے اس دور کو بھی تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور: پالی کا دور

۵۰۰ ق۔م سے مسیحی سنہ کی ابتدا کا دور ہے۔ یہ دور پالی کا دور ہے جب سنسکرت دیوبانی ہوگئی تو مقامی بولیاں ویدک زبان کے فطری رجحان پر چل پڑی اور عوام کی زبان ایک مخلوط زبان ہوتی گئی۔ پراکرت کا پہلا روپ پالی ہے۔ پالی کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جین مذہب کی کتابوں یا پھر اشوک کی لاٹوں پر کندہ کیے ہوئے شلوکوں میں ملتے ہیں۔ لفظ پالی سنسکرت کے لفظ پنکتی سے نکلا ہے، پالی کو قدیم مگدھی بھی کہتے ہیں۔ پالی میں مذہبی شاعری کہانیاں اور قواعد ولغت بھی دستیاب ہیں۔ پالی اس زمانے کی مقبول عام زبان تھی۔ اس لیے جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات اسی زبان میں دی جاتی تھیں۔

دوسرا دور: پراکرت کا دور

وسطی ہند آریائی کا دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتدا سے ۵۰۰ ءتک شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دور پراکرت کا دور کہلاتا ہے۔ پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں ہے بلکہ کئی زبانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ پراکرت کے معنی ہیں ایسی زبانیں جو اپنے فطری انداز میں پھل پھول رہی ہوں۔ اس عہد میں ادبی پراکرتوں کی پانچ شکلیں نظر آتی تھیں۔

﴿۱﴾ مہارشٹری:

یہ جنوب کی پراکرت ہے۔ یہ پراکرت مراٹھی زبان اسی سے نکلی ہے۔ اسے شاعری اور موسیقی کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں کے گیت اسی زبان میں لکھے جاتے تھے جس کی وجہ سے اس کو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں حرف علت کی کثرت ہے جس کی وجہ سے لوچ زیادہ آ گیا ہے۔ پرکرتوں میں سب سے پہلے مہارشٹری کی قواعد مرتب ہوئی۔ اس میں نظم ونثر کا قیمتی سرمایا موجود ہے۔

﴿۲﴾ شورسینی:

اس کا مرکز شورسین یعنی اتر پردیش متھرا کا علاقہ ہے۔ سنسکرت میں آعلی طبقے میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا، تو وہ یہی زبان تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اردو کا جنم شورسینی پراکرت سے ہی ہوا ہے۔

﴿۳﴾ مگدھی:

یہ پورے مشرقی ہندوستان کی بولی تھی۔ اس کا مرکز مگدھی یعنی جنوبی بہار تھا۔ چونکہ یہ آریاوں کے مرکز سے دور تھی اس لیے اس پر غیر آریائی بولیوں کا شدید اثر ملتا ہے۔ اس لیے آریا اس پراکرت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سنسکرت ڈراموں میں نچلے طبقے کے کرداروں کے مکالمے اسی زبان میں لکھے۔ اس پراکرت میں (ر) کی آواز نہیں تھی (ر) کو (ل) سے تبدیل کر کے استعمال کیا جاتا تھا۔

﴿۴﴾ اردھ مگدھی:

اس کے لفظی معنی ادھی مگدھی کے ہیں۔ اس کا مقام اودھ اور مشرقی اتر پریش ہے خاص طور پر بہار اور الہ آباد کے علاقے کی بولی تھی۔ یہ تمام پراکرتوں میں سب سے قدیم پراکرت ہے۔ اس میں اشوک کی تعلیمات کا بھی پرچار ہوا ہے۔ مغربی ہندوستان کے رہنے والے اسے

پراچیہ کہا کرتے تھے۔ پراچیہ کے تحت مگدھی اور اردھ مگدھی دونوں آ جاتی ہیں۔اس رواج اس زمانے کے شاہی خاندانوں میں بھی رہا ہے ۔شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔اس میں نظم ونثر دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔

﴿۵﴾ پشاچی:

سنسکرت میں پشاچھی بھوت کو کہتے ہیں۔ پشاچی کے معنی کچا گوشت کھانے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ سنسکرت کی ایک اہم بولی تسلیم کی جاتی ہے۔اس کا استعمال نول چال میں زیادہ ہوتی رہی ہے۔جس کی وجہ سے اس میں کی بولیوں کی ملاوٹ عمل میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے علمانے اس کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔اس کا علاقہ پنجاب اور کشمیر کا علاقہ ہے۔

تیسرا دور: اپ بھرنش کا دور

یہ دور ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء پر محیط ہے۔ یہ دور اپ بھرنش کا دور کہلاتا ہے۔اپ بھرنش کے معنی بگڑی ہوئی زبان کے ہیں۔اپ بھرنش کا لفظ پہلی بار بھرت منی کے ناڑیہ شاستر میں ملتا ہے۔اس کے بعد کالی داس کے وکرم اروشی میں نظر آتا ہے۔

شروع شروع میں لفظ اپ بھرنش کسی خاص زبان کے لیے استعمال نہیں ہوا تھا۔سنسکرت میں اپ بھرنش کے لیے ملچھ بھی استعمال بھی ہوا تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خان اپنی معرکتہ الآرا تصنیف مقدمہ تاریخ زبان اردو میں لکھتے ہیں۔''لفظ اپ بھرنش ایک خاص زبان کے معنوں میں سب سے پہلے ہیم چند نے استعمال کیا۔ یہ زبان عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ گجرات، راج پوتانہ اور دوآبہ میں بولی جانے والی اکثر بولیوں پر اس کا گہرا اثر پڑا۔۸۰۰ سے ۱۰۰۰ء تک دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی زبان بن گئی۔ اپنے آخری دور میں یہ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اپ بھرنش سے ہوئی ہے۔''

گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگر اپ بھرنش بھی کہتے ہیں۔ناگر اپ بھرنش کو فوقیت حاصل تھی کیونکہ یہ علمی طبقے میں بھی مقبول تھی۔ناگر نام گجرات کے ناگر برہمنوں کے نام پر رکھا گیا ہے۔

شورسینی اپ بھرنش کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کی کھڑی بولی ایک وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس لیے خیال کیا جاتا ہے اس علاقے کی تمام بولیاں ضرور اسی سے نکلی ہے۔کھڑی بولی کو آج بھی اتنا عروج حاصل ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کو کسی بھی زمانے میں حاصل نہ تھا۔ ادھر راجپوتوں کے زیر اثر دوآبہ کی زبان برج بھاشا چمکنے لگی اور سارے شمالی ہندوستان میں مقبول ہوگئی۔اسی دوآبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی رابطے کی زبان سمجھی جاتی ہے۔

01.09 ہند آریائی کا جدید دور ۱۰۰۰ عیسوی سے زمانہ حال تک

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ جدید ہند آریائی زبانیں کس سنہ سے شروع ہوئی۔ایک اندازے کے مطابق ۱۰۰۰ء جدید ہند آریائی آغاز کا زمانہ مانا جاتا ہے۔اس وقت ہندوستان میں اہم سیاسی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ مسلمان حملہ آور تیزی سے ہندوستان میں اپنے قدم جما رہے تھے۔شمال ومشرق میں لوگ دسویں صدی کے آخری حصے میں آئے اور اس کے بعد سارے ملک میں پھیلتے چلے گیے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب ''ہند آیائی اور ہندی'' میں لکھا ہے:

''اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل نہ کی ہوتی تب بھی جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوتی لیکن انہیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہوگئی اس میں ضرور دیر ہوتی۔''

پروفیسر مسعود حسین کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان کی آمد ہوئی۔ انہوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبان کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے۔ اسی لیے جب جدید ہند آریائی سے مختلف قوموں کا ربط وتعلق بڑھتا گیا تو بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کا امتزاج نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ان کی لسانی خصوصیات کے پیش نظر جدید ہند آریائی زبانوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم السنہ کے مطابق جدید ہند آریائی زبانوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے:

﴿۱﴾ سندھی:

یہ صوبہ سندھ کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ سندھی میں عربی وفارسی کے الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے۔ پاکستان میں سندھی عربی رسم الخط میں اور ہندوستان میں دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ لہندا:

یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے۔ یہ اپنے قواعد کے اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے۔ اس کا اپنا ایک خاص رسم الخط ہے لیکن عام طور پر اس کو فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ پنجابی:

مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں بیکانیری بولیوں سے گھری ہے۔ پنجابی کی ایک شاخ ڈوگری ہے جو جموں میں رائج ہے۔ پنجابی کا رسم لاخط گرمکھی ہے۔ امرتسر ضلع گرداس پور کی پنجابی سب سے معیاری سمجھی جاتی ہے۔ پنجابی فارسی گرمکھی اور دیوناگری تینوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

﴿۴﴾ گجراتی:

یہ کاٹھیاواڑ اور کچھ کی زبان ہے۔ جدید گجراتی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے بہت متاثر ہے۔

﴿۵﴾ راجستھانی:

یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے۔ اس میں قدیم ادب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندی کے کئی ویرگاتھا کال کے مشہور راسو راجستھانی میں لکھے گیے ہیں۔

مغربی ہندی:

گریرسن نے مدھیہ دیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی کا براہ راست تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں۔

﴿۱﴾ کھڑی یا ہندوستانی ﴿۲﴾ ہریانوی ﴿۳﴾ برج بھاشا
﴿۴﴾ قنوجی ﴿۵﴾ بندیلی

مشرقی ہندی:

مشرقی ہندی میں ما گدھی، اودھی، بگھیلی اور چھتیس گھڑھی بولیاں شامل ہیں۔ اودھی لکھنو فیض آباد، اور الہ آباد میں بولی جاتی ہے۔ اس کا ادب کسی زمانے میں بہت وقیع تھا۔ اس زمانے میں اس و بولی کی حیثیت ایک مستقل زبان کی تھی۔

01.10 مغربی ہندی

عہد وسطی میں مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت (جس کا مرکز متھرا تھا) نے ہندوستان کی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ شورسینی پراکرت کے بعد شورسینی اپ بھرنش کا دور ہے۔ اس عہد میں بھی اس علاقے کی اپ بھرنش کو عروج حاصل رہا۔ دوآبہ گنگ وجمن کی شورسینی اپ بھرنش سارے شمالی ہندوستان کی لینگوا فریقہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ ۱۰۰۰ عیسوی میں جب ترک پنجاب کے میدان میں داخل ہوئے تو اس وقت شورسینی اپ بھرنش عروج پر تھی۔ اس نے ادبی شکل اختیار کر لی۔ اسی کی بول چال کو گریرسن اور چٹرجی نے مغربی ہندی کا نام دیا اسی سے ہندوستان کی اکثر جدید زبانوں کا آغاز ہوا۔

اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی ہے۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں سے گھری ہوتی ہے۔ مغربی ہندی کی تمام بولیوں کا تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ جس سے جدید آیائی زبانیں نکلی ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں۔

﴿۱﴾ کھڑی ﴿۲﴾ ہریانوی ﴿۳﴾ برج

﴿۴﴾ قنوجی ﴿۵﴾ بندیلی

کھڑی بولی:

ضلع انبالا کی تحصیل انبالہ ضلع بلند شہر کا شمالی حصہ بجنور، مرادآباد، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کے میدانی علاقوں میں کھڑی بولی کا ہین چلن ہے۔ میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کی کھڑی بولی معیاری سمجھی جھاتی ہے۔ مظفر نگر میں تشدید کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں کی کھڑی بولی میں میں مارتا ہوں کی جگہ میں ماروں ہوں بھی کہا جاتا ہے۔ اسما بنانے کے لیے اسم کے آخر میں (اں) کا استعمال کیا جاتا ہے مثلاً عورتاں، قلماں، مکاناں وغیرہ۔ ضمیر میں تیرا کا کی جگہ تجھ اور مجھ ملتا ہے۔ کھڑی بولی کی جھلکیاں قدیم اپ بھرنش میں نظر آتی ہیں۔ کھڑی بولی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قدیم ترین مانی جاتی ہے۔ اس کا کوئی بھی نمونہ پندرہویں سے قبل نہیں ملتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ میرٹھ اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔ اس کے اثرات ہمہ گیر تھے، کھڑی بولی اپنے علاقے سے آگے بڑھ کر پنجابی کو بھی متاثر کرتی ہے۔

ہریانوی:

اس کو بانگڑو اور جاٹو بھی کہتے ہیں۔ دہلی کے اندر یہ زبان جاٹو کے نام سے مشہور ہے کیونکہ آس پاس کے علاقے میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ ہریانی دلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال روہتک، حصار اور گڑگاؤں میں بولی جاتی ہے۔ ہریانہ میں مسلمانوں کی آبادی قدیم زمانے سے ہی پائی جاتی ہے۔ سلاطین دہلی کے لشکروں میں بھرتی عام طور پر اسی علاقے کے جنگجو قبائل سے ہوتی ہے۔

ہانسی، ناروال اور جھجر کو سیاسی اعتبار سے مختلف زبانوں میں اہمیت حاصل رہی اس علاقے کی زبان میں کافی الٹ پھیر ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانی میں بھی کھڑی کے افعال استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی پنجابی کی مثال دی جاتی ہیں۔ یہاں کھڑی کا کرتا اور کہتا کے ساتھ پنجابی اور لہندا کا کردا کہد ابھی ملتا ہے۔

برج بھاشا:

پرج بھاشا شورسینی اپ بھرنش کی سچی جاں نشین ہے۔ یعنی برج بھاشا مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت کی مجموعی خصوصیات کی حامل ہے۔ شورسینی متھرا کے علاقے کا قدیم نام ہے۔ برج کے معنی جانوروں کا ہڈا کے آتے ہیں۔ چوں کہ اس علاقے میں گائے کی بہت اہمیت ہے اس کی وجہ سے برج کا لفظ وجود میں آیا۔

بر بھاشا ادب کی زبان تھی۔ سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش میں جو ادب اور قواعد کی کتابیں لکھی گئی ان کے بعد تصنیف وتالیف کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ہرج بھاشا کی اہمیت کا راز بھگتی تحریک میں بھی نظر آتا ہے۔ اس مذہبی تحریک کا مرکز اصلی متھرا کا علاقہ ہے۔ پرج بھاشا شاہجہاں کی خاص بولی تھی۔ اس تحریک کے اپ دیشک اپنی بانی کو دور دور تک اسی زبان میں پھیلاتے تھے۔

اُردو میں اسما بنانے کے کئی قاعدے ہیں ان میں سے (وں) لگا کر بھی جمع بنائی جاتی ہیں۔ پرج بھاشا میں (ن) کے اضافے کے ساتھ جمع بنائی جاتی ہے۔ مثلاً کھوڑوں سے کھوڑن۔

اُردو میں فعل مضارع (تا) لگا کر بنایا جاتا ہے، جبکہ برج بھاشا میں صرف (ت) لگا کر فعل مضارع بنایا جاتا ہے۔ مثلاً کرتا ہے۔ بھرتا ہے۔ کرت ہے بھرت ہے۔

برج بھاشا میں حرف علت کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں الف، واؤ اوری کا استعمال کیا جاتا ہے۔ برج بھاشا میں لفظ (ل) کے بجائے لفظ (ر) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کاجل سے کجرا بادل سے بدریا وغیرہ۔

قنوجی:

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام شہر قنوج کے نام پر ہے جو ضلع فرخ آباد میں ہے۔ قنوجی ہندوستانی لفظ ہے جسے ہندی میں کنوج کہا جاتا ہے۔ قنوجی شاہجہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے۔ جہاں پر یہ پرج بھاشا سے مل جل جاتی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں پرج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔ مشرق وشمال مشرق میں یہ اودھی سے گھری ہوئی ہے۔ ادبی حیثیت سے یہ برج بھاشا سے پیچھے رہ گئی۔

بندیلی:

یہ بندیل کھنڈ کی بولی ہے جو شمال میں آگرہ، مین پوری اور ایٹہ ضلع تک رائج ہے۔ شمال مغرب میں قنوجی اور پرج بھاشا سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں راجستھانی بولیاں رائج ہیں۔ جنوب میں اس کے حدود مراٹھی سے ملتی ہیں۔ بندیلی میں ادب کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ اس میں عام طور پر حروف علت (ی) عموماً (ے) سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ مونث بنانے کے لیے (ن) کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے کتے سے کتن، بہت کو بھوت کہا جاتا ہے۔ ہندی ادب کے کیشو داس اور پدما کرنے اسی بندیلی میں شاعری کی ہے۔

01.11 خلاصہ

انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ زبان ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کا درجہ دیا جاتا ہے کیوں کہ اس میں نطق پایا جاتا ہے۔ نطق سے مراد وہ انسانی جوہر ہے جس کی مدد سے انسان میں بولنے اور بات چیت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

زبان انسان کی معاشرتی و سماجی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر وجود میں آئی۔ زبان کب وجود میں آئی؟ اس کا تعین کرنا مشکل و پیچیدہ کام ہے۔ زبان بامعنی، آوازوں کے مجموعے کا نام ہے۔ زبان وہ آلہ کار ہے جس کی مدد سے ہم بول کر، لکھ کر یا اشاروں کے ذریعہ اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار بہت آسانی سے کر پاتے ہیں۔ زبان کسی ملک اور سماج کے افراد کے ذریعہ احساسات و خیالات کی ترسیل کے لیے استعمال کیے جانے والے ایک نظام کا نام ہے۔ زبان کو زمانہ قدیم سے لے کر اب تک ذرائع ابلاغ کے روپ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

بولی کو انگریزی میں Dialect کہا جاتا ہے۔ بولی وہ مقامی زبان ہے جس میں عام طور پر لوگ بات چیت کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے قواعد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی خطے کی بولیوں میں فرق ہوسکتا ہے۔ زبان کا علاقہ وسیع و عریض ہوتا ہے جبکہ بولی ایک مخصوص و محدود خطے میں بولی جاتی ہے۔ ایک علاقے میں کئی بولیاں ہوسکتی ہے جبکہ عمومی طور پر زبان ایک ہی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں ہندیورپی زبانوں کا سلسلہ تقریباً ۳۵۰۰ ق۔م سے ملتا ہے۔ ہندیورپی زبانیں ترقی کرتی ہوئی جب اپنی دوسری منزل میں قدم رکھا تو انہیں ہندایرانی زبان کا نام دیا گیا۔ ہندیورپی زبانوں میں ادب اور دونوں حیثیتوں سے ہندایرانی کو سب سے قدیم اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ ہندایرانی نے ترقی پا کر تین شکلیں اختیار کر لیں۔ اس کا جو گروہ ایران میں مقیم رہا اس سے موجودہ ایرانی زبان کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض افراد ہجرت کر کے کشمیر اور اسکے قرب و جوار میں رہائش پزیر ہوئے انکی زبان پشاچی زبان کہلائی ہے۔

ہندوستان میں ہندآریائی کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

﴿۱﴾ قدیم ہندآریائی ﴿۲﴾ وسطی ہندآریائی ﴿۳﴾ جدید ہندآریائی

قدیم دور میں وِیدک اور سنسکرت زبان کا رواج عام تھا۔ جو دراصل سنسکرت کی قدیم شکل کا عہد ہے۔ اس دور میں چاروں ویدوں۔ رگ وید۔ سام وید۔ یجر وید۔ اتھر وید۔ ملتے ہیں۔ ہر قسم کے علمی اور مذہبی مطالعے میں سنسکرت کی بڑی اہمیت تھی۔

وسطی ہندآریائی کا دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتدا سے ۵۰۰ ءتک شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دور پراکرت کا دور کہلاتا ہے۔ پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں ہے بلکہ کئی زبانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ پراکرت کے معنی ہیں ایسی زبانیں جو اپنے فطری انداز میں پھل پھول رہی ہوں۔

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ اسی لیے جب جدید ہندآریائی سے مختلف قوموں کا ربط و تعلق بڑھتا گیا تو بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کا امتزاج نظر آنے لگا۔ مغربی ہندی کی تمام بولیوں کا تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ جس سے جدید آیائی زبانیں نکلی ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں۔

﴿۱﴾ کھڑی ﴿۲﴾ ہریانوی ﴿۳﴾ برج

﴿۴﴾ قنوجی ﴿۵﴾ بندیلی

01.12 فرہنگ

آلہ : ہتھیار
احساس کی جمع : احساسات
ارتقا : ترقی کرنا
اسر : ہندو دیوتاؤں کے دشمن
ایجاد کرنا : کوئی نئی چیز بنانا
پالی : پنکتی کو کہتے ہیں
پشاچی : کچا گوشت کھانے والے افراد
ترسیل : ارسال، ابلاغ، روانہ کرنا
تغیرات : تغیر کی جمع، تبدیلی
تکمیل : پورا کرنا
تنوع : قسم قسم کا ہونا، جدت، رنگ رنگ کا ہونا
ٹکسال : وہ مقام جہاں پر سکے ڈھالے جاتے ہیں
خیال کی جمع : خیالات
رقم طراز : لکھنے والا
سوتر : ہندو مذہب کی ایک خاص ادبی صنف کا نام
ضابطہ : اس کی جمع ضوابط، کوئی رول یا قاعدہ

عروج : بلندی، اسکی ضد زوال ہے
عضوی حرکات : جسم کے کسی عضو کی حرکت، جیسے ہاتھ کی
فقدان : کمی، قلت
قوت گویائی : بولنے کی طاقت یا صلاحیت
کلی طور پر : پورے طریقے سے
کنایات : کنایہ کی جمع، اشارہ
مافی الضمیر کا ادا کرنا : اپنی بات کا صحیح طور پر اظہار کرنا
متفق علیہ : جس بات پر سب کا اتفاق ہو
محدود : کسی دائرے تک قید ہونا، Limited
مرحلہ : دور، Stage
معرض وجود میں آنا : کسی چیز کا پیدا ہونا
ملفوظی : جو لکھا جائے، تحریر کیا ہوا
نشونما : پیداوار، کسی چیز کی بڑھوتری
نطق : بولنے کی صلاحیت
وسطی : درمیانی، Middle
وسیلہ : ذریعہ

01.13 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : زبان سے آپ کیا سمجھتے ہیں تحریر کیجیے۔
سوال نمبر۲ : بولی کسے کہتے ہیں؟ کچھ مشہور بولیوں کے نام تحریر کیجیے۔
سوال نمبر۳ : قدیم ہند آریائی سے متعلق اپنی معلومات کو قلم بند کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : زبان اور بولی میں فرق کو واضح کیجیے۔
سوال نمبر۲ : ادبی پراکرت کے متعلق ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
سوال نمبر۳ : مغربی ہندی کی پانچ بولیوں سے متعلق ایک مختصر مضمون لکھیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : مغربی ہندی کی کتنی بولیاں ہیں؟

(الف) تین (ب) چار (ج) پانچ (د) چھ

سوال نمبر۲ : برج بھاشا کس علاقے میں بولی جاتی ہے؟

(الف) بہار (ب) متھرا (ج) مغربی بنگال (د) مہارشٹر

سوال نمبر۳ : ہند آریائی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

(الف) ۲ (ب) ۳ (ج) ۵ (د) ۴

سوال نمبر۴ : قنوجی بولی کس ضلع میں بولی جاتی ہے؟

(الف) لکھنؤ (ب) کان پور (ج) فرخ آباد (د) الہ آباد

سوال نمبر۵ : بولی کی انگریزی صطلاح کیا آتی ہے؟

(الف) **Dilect** (ب) **Dylects** (ج) **Dalect** (د) Dialect

سوال نمبر۶ : گریرسن نے کہاں کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا ہے؟

(الف) مدھیہ دیش (ب) شمالی ہندوستان (ج) جنوبی ہندوستان (د) مشرقی دیش

سوال نمبر۷ : درج ذیل میں مغربی پنجاب کی زبان ہے؟

(الف) پنجابی (ب) لہندا (ج) بشتو (د) برج بھاشا

سوال نمبر۸ : ہندوستانی لسانیات کا خاکہ کس ناقد کی کتاب ہے؟

(الف) پروفیسر احتشام حسین (ب) آل احمد سرور (ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) عبادت بریلوی

سوال نمبر۹ : ہند آریائی اور ہندی کس کی کتاب ہے؟

(الف) سنیتی کمار چٹرجی (ب) عبادت بریلوی (ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) آل احمد سرور

سوال نمبر۱۰ : شورسینی اپ بھرنش کی سچی جاں نشین ہے؟

(الف) بندیلی (ب) پرج بھاشا (ج) کھڑی (د) قنوجی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) پانچ

جواب نمبر۲ : (ب) متھرا

جواب نمبر۳ : (ب) ۳

جواب نمبر۴ : (ج) فرخ آباد

جواب نمبر۵ : (د) **Dialect**

جواب نمبر۶ : (الف) مدھیہ دیش

جواب نمبر۷ : (ب) لہندا

جواب نمبر۸ : (الف) پروفیسر احتشام حسین

جواب نمبر۹ : (الف) سنیتی کمار چٹرجی

جواب نمبر۱۰ : (ب) پرج بھاشا

01.14 حوالہ جاتی کتب

ا۔ تاریخ ادب اردو	از	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔ تاریخ ادب اردو	از	رام بابو سکسینہ
۳۔ اردو ادب کی لسانی تشکیل	از	فرحت اللہ بیگ
۴۔ اردو کی بولیاں اور کرخنداری	از	پروفیسر نصیر احمد خان
۵۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	از	پروفیسر احتشام حسین
۶۔ دکن میں اردو	از	نصیر الدین ہاشمی
۷۔ اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	از	مولوی عبدالحق

اکائی 02 : مغربی ہندی کی بولیاں

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : مغربی ہندی کی بولیاں

02.04 : مغربی ہندی کی پانچ زبانیں

02.05 : کھڑی بولی کا پس منظر

02.06 : خلاصہ

02.07 : فرہنگ

02.08 : نمونہ امتحانی سوالات

02.09 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

ہمارے جو طلبا شروع سے اُردو زبان وادب کی تعلیم حاصل کرتے آرہے ہیں اور وہ ادب کے علاوہ اُردو زبان کی تاریخ سے بھی روشناس ہونا چاہتے ہیں۔اس سبق کا مقصد اُنہیں درج ذیل معلومات مہیا کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزر کر اُردو نے ایک رابطے کی زبان کا درجہ پایا ہے اور اس کی ادبی تاریخ کا آغاز کب ہوا اور اس کا دوسری بولیوں سے کیا رشتہ ہے؟

02.02 تمہید

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔یہ کئی جغرافیائی اور تہذیبی خطوں میں بٹا ہوا ہے۔ہر خطّے اور علاقے میں پروان چڑھنے والی ثقافت کی اپنی چند خصوصیات ہیں،اسی طرح اُن کی اپنی بولی بھی ہے۔عموماً ان بولیوں کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں ہے بعد ازاں ناگری اور اُردو رسم الخط میں ان کے ادب کو منتقل ضرور کیا گیا ہے۔لسانیاتی سطح پر ان زبانوں کی پانچ شاخیں تسلیم کی گئی ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ زبانیں ہیں۔برج بھاشا،قنوجی،بندیلی،ہریانوی،اور کھڑی بولی،کھڑی بولی ہی سے اُردو نکلی ہے۔اِکائی میں اس موضوع پر خصوصاً تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

02.03 مغربی ہندی کی بولیاں

ان زبانوں کے حدودِ اربعہ میں مدھیہ پردیش شامل ہے۔مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمالی ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل پہاڑ تک ان کا علاقہ ہے۔اس حدودِ اربعہ کے اطراف شمال مغرب میں پنجابی،جنوب میں مراٹھی اور

شمال میں پہاڑی بولیاں بولی جاتی ہیں۔مغربی ہندی چوں کہ چاروں طرف بیرونی زبانوں سے گھری ہوئی ہے اس لئے گریرسن کے نظریے کے مطابق یہی ایک خاص زبان ہے جو اندرونی دائرے میں خوب پھلی پھولی۔ یہ زبان چوں کہ اندرونی دائرے کی سب سے ترقی یافتہ زبان ہے اس لئے ہند آریائی زبانوں کی نمائندہ مانی جاتی ہے۔گریرسن نے جن زبانوں کے مجموعے کو مغربی ہندی کہا ہے اس میں برج بھاشا، قنوجی، بندیلی، ہریانوی اور کھڑی بولی یا ہندوستانی کا شمار ہوتا ہے۔

مغربی ہندی کا قدیم ترین نمونہ چندر بردائی کی نظم ''پرتھوی راج راسو'' ہے۔اس میں شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کی لڑائی کے واقعات ۶۹ ر بندوں میں منظوم کیے گئے ہیں اور یہ تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔مغربی ہندی میں ترتیب دی ہوئی یہ قدیم ترین رزمیہ نظم ہے۔''پرتھوراج راسو'' میں رزم و بزم دونوں کا ذکر ہے اور جذبات کی عکاسی میں فطری پن موجود ہے۔شاعر نے عورتوں کے جذبات کی عکاسی بھی فطری انداز میں کی ہے۔مغربی ہند کے قدیم ترین نمونوں میں سادھوں اور ہندو سنتوں کی تخلیقات بھی ملتی ہیں۔

''پرتھوری راج راسو'' کے اُسلوب میں مغربی ہندی میں اور بارہ رزمیہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔

ان میں ''آلاہ اُودَل'' بھی معروف ہے۔اس کی زبان صاف اور ستھری ہے۔یہ مثال ملاحظہ ہو:

بارہ برس لَو کُوکر جیے، اور تیرہ لو جیے سیار برس اٹھارہ کشتری جیے، آگے جیون کو دھکّار

''راسو'' تصانیف کی روایت کے بعد مغربی ہند کا سب سے بہتر نمونہ ہمیں امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے۔ان کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور بعض اشعار میں مغربی ہندی کی جھلکیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں۔ بعد میں عبدالرحیم خانِ خاناں، کبیر، نام دیو کے کلام میں اس زبان کے ابتدائی نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

لسانیاتی اصولوں کے مطابق مغربی ہندی کا براہِ راست تعلق شورسینی اَپ بھرنش سے جوڑا جاتا ہے۔شورسینی اَپ بھرنش کا علاقہ لاہور سے بنگال تک وسیع تھا اور اس کا مرکز متھرا تھا۔اس کی شمال مغربی بولیاں لاہور تک بولی جاتی تھیں۔کھڑی بولی اور ہریانوی اس کی مثال ہیں۔ جنوب مغرب میں گجراتی اور راجستھانی زبانیں جو اگرچہ بیرونی دائرے سے تعلق رکھتی تھیں شورسینی اَپ بھرنش کے زیر اثر اس قدر آ گئی تھیں کہ ان کا شمار اثر پذیری کی وجہ سے اندرونی زبانوں میں ہونے لگا تھا۔

02.04 مغربی ہندی کی پانچ زبانیں

﴿۱﴾ **برج بھاشا:** بریلی، علی گڑھ، آگرہ، متھرا، دھول پور اور کرولی میں بولی جاتی ہے۔ یہ قدیم شورسینی سے بہت قریب ہے۔ برج بھاشا اور اودھی یہ دونوں زبانیں ایک عرصے تک بالائی دوآبۂ گنگا کی ادبی زبانیں رہیں۔ برج بھاشا کا اصل وطن تو متھرا ہے لیکن اس کے حدود میں بلند شہر سے بریلی تک کا علاقہ شامل ہے۔جنوب میں اس کا اثر گوالیار تک دکھائی دیتا ہے۔البتہ متھرا کی برج بھاشا کو معیاری سمجھا جاتا ہے۔اس کے حدودِ اربعہ میں رائج بولیوں کے اثرات بھی برج بھاشا پر مرتب ہوئے ہیں اس لئے مختلف علاقوں میں اس کے لب و لہجے اور لفظیات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بلند شہر اور اس کے اطراف میں برج بھاشا، کھڑی بولی کے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ جے پور میں راجستھانی سے گھُل مل جاتی ہے اور گڑگاؤں میں اس پر میواتی اثر دکھائی دیتا ہے۔اتنے اثرات کو قبول کرنے کے بعد بھی اس کی ادبی حیثیت کم نہیں ہوئی۔اس زبان کے ادب

میں آج بھی سورداس، سورج اور تلسی داس ششی بنے ہوئے ہیں۔ یہی زبان ہے جس میں کرشن کی بانسری کی آواز بھی ہے اور رام کی صحرانوردی کی داستان بھی ہے۔ ان دونوں عناصر نے برج بھاشا کو تقدّس کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں صرف برج بھاشا ہی ایسی بولی ہے جس میں مذہبی ادب کا وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ **قنوجی:** گریرسن نے مغربی ہندی میں جن زبانوں کو شامل کیا ہے اس میں قنوجی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ قنوجی برج سے نہایت قریب ہے اور ان کے قواعد بھی بڑی حد تک یکساں ہیں اس لئے گریرسن کو دونوں کو علاحدہ علاحدہ زبان سمجھنے میں تأمل ہے۔ اس نے محض قنوج کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر اسے زبان کی علیحدہ حیثیت کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ وگرنہ وہ اس بات پر ہی مُصِر تھا کہ قنوجی کو زیادہ سے زیادہ برج کی ذیلی بولی سمجھا جائے۔ قنوجی اگرچہ شہر قنوج سے منسوب زبان ہے مگر یہ دوآبہ کے بالائی علاقہ سے برج بھاشا کے مشرقی علاقے تک بولی جاتی ہے۔ قنوج ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ سنسکرت کے قدیم ادب اور رامائن میں بھی اس کا ذکر ہے۔

۱۱۹۳ء میں راٹھور راجپوتوں کے آخری بادشاہ جے چند کی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہونے پر قنوج مسلم حکمرانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس زمانے کے قنوجی زبان کے ادبی نمونے آج نہیں ملتے اس لئے قدیم قنوجی زبان وادب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ فی زمانہ قنوجی اپنی خالص شکل میں ایٹہ، فرخ آباد سے کان پور، ہردوئی تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ البتہ کان پور میں یہ تبدیلی اور ہردوئی میں اودھی لب ولہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ شاہ جہاں پور سے لے کر پیلی بھیت تک اس پر برج کا اثر نمایاں ہے۔ برج اور قنوجی دونوں میں حروف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں 'وا' بڑھا دیا جاتا ہے جیسے گھر سے 'گھروا' آپس سے 'آپسوا' وغیرہ۔ قنوجی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ زبانوں کے اثرات کو بھی باآسانی قبول کر لیتی ہے۔ جیسے 'کہی ہو' کو قنوجی میں درمیانی 'ہ' گرا کر بولا جائے گا 'کئی او' اس طرح اپنے اطراف میں بولی جانے والی اودھی، برج، بندیلی زبانوں کے مطابق اس کا اپنا لب ولہجہ بدلتا رہتا ہے۔

﴿۳﴾ **بندیلی:** اس زبان کو بندیل کھنڈی بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان بندیل کھنڈ اور وسط ہند کے علاقوں میں رائج ہے۔ اس کے حدودِ اربع میں شمال میں جھانسی، ہمیر پور، شمال مغرب میں گوالیار، بھوپال، مشرق میں ساگر، دموہ اور جنوب میں ہوشنگ آباد، نرسنگھ پور اور سیونی وغیرہ شامل ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں بندیلی کی ترقی نہایت تیزی سے ہوئی تھی اور کئی معروف شعرا کی تخلیقات اس زبان میں ملتی ہیں۔ بندیلی پر اطراف واکناف کی زبانوں کا بھی اثر ہوا ہے۔

اس میں برج اور قنوجی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں لیکن برج اور بندیلی زبانوں میں صرفی ونحوی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً برج کی طرح بندیلی میں 'اِ' اور 'اُ' پر ختم ہونے والے اسما نہیں ملتے۔ بعض جگہ الفاظ کی شکلیں اودھی سے ملتی جلتی ہیں۔ بندیلی کی بعض تراکیب محاورہ پن لیے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً 'موں پے جو کام نہ ہوئی یے' (یعنی مجھ سے یہ کام نہ ہوگا) 'وانے بیٹھو' (یعنی وہ بیٹھا) گریرسن نے بندیلی کی مزید شاخوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جیسے بندیلی، جنوبی اَپ بھرنش بندیلی، شمال مشرقی ملی جلی بندیلی، کراڈی، گاولی، بنافری، کوشٹی، کُمھاری، لودھی، کنڈری، پنواڑی، رگھونشی، سہوریا وغیرہ۔

﴿۴﴾ **ہریانوی:** اسے بانگڑو یا جاٹو بھی کہا جاتا ہے۔ بانگڑو یہ لفظ ''بانگرو'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ''بانگرو'' لفظ ''بانگر'' سے مشتق ہے۔ اس کے معنی اونچی زمین کے ہوتے ہیں یعنی بلند اور اونچی زمین میں بولی جانے والی زبان۔ عموماً یہ زبان کرنال، روہتک اور دہلی

میں بولی جاتی ہے مگر شمال مشرقی پٹیالہ، مشرقی حصار، نابھا اور زِند میں بھی اس زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ زبان جاٹ قوم کی عام زبان مانی جاتی ہے اس لئے اسے جاٹو بھی کہتے ہیں۔ گریرسن ہریانوی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر رام ولاس شرما کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے علاقے کی عوامی زبان ہریانوی زبان ہی کا ایک روپ ہے۔ ہریانوی زبان میں حروف علّت کی آوازوں میں تعین صَوت نہیں پایا جاتا۔ جیسے رہا/رہیا، جواب کا جُواب، بہوت کا بہت وغیرہ۔ اسی طرح اِے، اَے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ 'ن' کی آواز 'ن ط' میں بدل جاتی ہے، اُردو میں 'ن ط' کی آواز ہی نہیں پائی جاتی۔ ہریانوی کی ضمیریں بھی ہندی سے علیحدہ ہیں۔ ہریانوی پر پنجابی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ مثلاً 'کرتا' کو 'کردا' اور 'کہتا' کو 'کہند ا' اس کی مثالیں ہیں۔ کھڑی بولی کے اثر سے بھی ہریانوی محفوظ نہیں۔ 'وہ جاوے ہے' بھی وہاں موجود ہے تو 'وہ جاسے' بھی کبھی کبھار روزمرہ کی بولی میں درآتا ہے۔

ہریانوی کے ادبی معیار کو پرکھنے کے بعد ہی میر عبدالواسع ہانسوی نے اس زبان کی لغت بنام غرائب اللغات مرتب کی تھی۔ خان آرزو نے اسی لغت پر بہت ساری جگہوں پر گرفت بھی کی ہے اور وہ سند ہمیشہ ہریانوی لغت سے لینے کے برج بھاشا سے لیتے تھے۔

﴿۵﴾ کھڑی بولی یا ہندوستانی: اگرچہ کھڑی بولی کو ہندوستانی، ناگری، سرہندی اور کوروی کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ معروف و مستعمل نام کھڑی بولی ہی ہے۔ اس کا علاقہ بہت وسیع ہے اور یہ مغربی روہیل کھنڈ، گنگا کا شمالی دوآبہ، رام پور، مرادآباد، بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفرنگر، دہرادون کے میدانی علاقے، انبالہ، کلسیا اور پٹیالہ کے مغربی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ گریرسن نے اس زبان کو بولنے والوں کی تعداد ۵۳/لاکھ بتائی تھی مگر اب یہ کروڑوں کی زبان ہے۔ کھڑی بولی پر پنجابی، راجستھانی اور اُردو کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ ماہرین تاریخی اعتبار سے اس زبان کا رشتہ پنجابی اَپ بھرنش سے جوڑتے ہیں۔

02.05 کھڑی بولی کا پس منظر

ماہرین لسانیات کا قیاس ہے کہ کھڑی بولی ہندو اور مسلمانوں کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکی، فارسی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اس وقت کی مروجہ زبان میں شامل ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ کھڑی بولی کا ہیولیٰ تیار ہوتا گیا۔

''تاریخ ہندی ادب'' کے مصنف سید ظہیرالدین احمد علوی کے مطابق:

> ''پہلے یہ بھاشا بازاروتھی۔ آہستہ آہستہ سدھرتی گئی۔ ایک عرصے تک میل جول جاری رہا کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے فارسی و عربی کے الفاظ زیادہ شامل کیے اور صرف ونحو اور افعال کی ترکیب بھی اسی نہج پر کرنا چاہی۔ اہل ہنود نے اسے سنسکرت وِیاکرن کے مطابق ڈھالنا شروع کیا.....اس طرح اس ایک زبان کی تین شاخیں ہوگئیں:
>
> **(۱)** شدھ ہندی جو ہندوؤں کی ادبی زبان ہے اور صرف اُنہی میں رائج ہے۔
>
> **(۲)** اُردو جو مسلمانوں اور تقریباً ساٹھ فی صد ہندوؤں کی ادبی زبان ہے اور ان کے گھروں میں عام بول چال کی زبان ہے۔

(۳) ہندوستانی جس میں ہندی اُردو دونوں کے الفاظ شامل ہیں۔اس زبان میں ابھی ادبی کارنامے شامل نہیں اور ہیں بھی تو برائے نام یہ تیسری شاخ سیاسی اغراض کے ماتحت وجود میں لائی گئی۔''

(سید ظہیر الدین احمد علوی: تاریخ ہندی ادب، لالہ رام نرائن لال بک سیلر الہ آباد ۱۹۸۵ء، ص ۱۶)

﴿۱﴾ کھڑی بولی کی ابتدا کے متعلق بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے الہ آباد میں منعقد ایک جلسے میں ہندی ساہتیہ سمّیلن کے صدر نے اس کی تائید بھی کی تھی۔ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اثر سے اس میں ہر قسم کے الفاظ داخل ہو گئے۔ لیکن کھڑی بولی اس وقت سے رائج ہے جب اودھی یا برج بھاشا موجود تھیں۔کھڑی بولی اولاً بول چال کی زبان تھی مسلمانوں نے اسے اپنایا اور ترقی کے زینے طے کراتے ہوئے اسے ادبی زبان بنا دیا۔

کھڑی بولی کا سب سے قدیم نمونہ نام دیو کی شاعری میں ملتا ہے۔جو مراٹھی کے اولین شاعر گیانیشور کے معاصر تھے۔انہوں نے اپنا اکثر وقت مسلمان صوفیوں کے ساتھ گزارا تھا۔نام دیو کا یہ مشہور شعر کھڑی بولی کی قدیم ترین مثال ہے:

ابھے انتر کالا رہے باہر کرے اجاس نام کہے ہری بھگت بِن پہنچے ترک نواس

نام دیو کہتے ہیں کہ جس کا باطن سیاہ اور ظاہر اُجلا ہو وہ شخص بغیر بھگتی کے دوزخ میں جگہ پاتا ہے۔بعض ماہرین نام دیو سے منسوب تخلیقات کو اصل نہیں مانتے۔اگر ان کے دلائل صحیح بھی ہوں تب بھی ان کے ہی معاصر امیر خسرو کے ہندوی کلام کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ نام دیو کے بعد ان کا ہی نام کھڑی بولی کے ادب میں نمایاں ہے۔انہوں نے عربی فارسی الفاظ کھڑی بولی میں شامل کر کے ادب کے ذریعہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادب میں قومی یک جہتی کی روایت کا یہ ابتدائی نمونہ ہے۔''خالق باری'' ایک منظوم لغت بھی ان سے منسوب ہے۔ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں جیسی اصناف میں بھی خسرو نے کھڑی بولی میں اپنی تخلیقات چھوڑی ہیں۔ان اُمور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھڑی بولی تیرہویں صدی میں اپنا وجود منوا رہی تھی اور ادبی تخلیقات دھیرے دھیرے اس میں جگہ پا رہی تھیں۔

﴿۲﴾ یہ خیال ہے۔شورسین دیش (متھرا اور قرب وجوار) میں بولی جانے والی شورسینی اَپ بھرنش ہی سے کھڑی بولی پروان چڑھی ہے۔مغربی ہندی کی اسی بولی کو جو دوآبہ کے شمال اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی رہی ہے گریرسن اسے ہندوستانی کہتا ہے۔اس میں اور ادبی اُردو میں ماں بیٹی کا تعلق ہے۔اس رشتے کو مسعود حسین خاں مانتے ہیں مگر بیرونی اثرات کی وجہ سے پیدا ہونے والے بعض اختلافات کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔مثلاً گنگا کے پورب میں مراد آباد، بجنور، رام پوران مقامات کی بولی ادبی ہندوستانی سے قریب ترین ہے ان مقامات میں مسلمانوں کی کثیر تعداد ہے اور ان کے تمدّن کا گہرا اثر رہا ہے۔گنگا کی دوسری طرف دوآبہ کے بالائی حصّہ کی بولی بھی ادبی ہندوستانی سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن یہاں کی زبان میں بہت سی ایسی شکلیں رائج ہیں جو مراد آباد، بجنور اور رام پور کے اضلاع میں متروک ہیں۔غرض یہ کہ وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہونے کی وجہ سے اطراف واکناف کی زبانوں اور بولیوں کے اثرات کھڑی بولی پر مرتب ہوئے ہیں۔

ہندوستانی زبان اور ہندوستانی بولی میں تلفظ کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ہندوستانی بولی میں 'ن ط' کا استعمال پنجابی اور ہریانوی کی طرح عام ہے لیکن ہندوستانی زبان (اُردو) میں یہ مطلق دکھائی نہیں دیتا۔حالت جمع میں ہندوستانی بولی میں 'آں' جوڑتے ہیں جیسے عورتاں،

باتاں وغیرہ لیکن اُردو میں قدیم دکنی کے علاوہ اس کا استعمال نہیں ہے۔ زمانۂ حال میں افعال کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں ماروں ہوں بجائے مارتا ہوں، مارے ہے بجائے مارتا ہے وغیرہ۔ کھڑی بولی کے بارے میں گریرسن کی یہ رائے ہے کہ ڈول اور کینڈا کے لحاظ سے یہ دیگر زبانوں سے زیادہ برج سے قریب ہے لیکن تاریخ میں جھانکیں تو پتہ چلتا ہے کہ برج جب رائج تھی اس وقت بھی بعض علاقوں میں کھڑی بولی مستعمل تھی۔ اس لئے کھڑی بولی کو ہم برج سے نکلنے والی زبان قرار نہیں دے سکتے۔

02.06 خلاصہ

اردو زبان کے آغاز وارتقا پر غور کرنے سے پہلے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ہمارا خاص موضوع مغربی ہندی اور اس کی بولیوں سے متعلق ہے۔ اس کے تحت مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کی خاص اہمیت ہے۔ جو برج بھاشا، قنوجی، بندیلی، ہریانوی، کھڑی بولی پر مشتمل ہیں۔ کھڑی بولی ہی سے اُردو نکلی ہے۔ جو ابتدا میں محض بولی کی شکل میں تھی۔ بعد ازاں اس کی لغات وسیع ہوتی گئی اور ادبی روایتیں قائم ہوتی گئیں۔ آج اسے ایک عوامی رابطے کی زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس کے ادب کی صدیوں پر مشتمل ایک تاریخ ہے جس نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب پر بھی اثر قائم کیا ہے اور جو ہندوستان کے علاوہ کئی دوسرے ممالک میں پڑھائی جاتی ہے اور جس کو سمجھنے اور ادب تخلیق کرنے والے دُنیا کے کئی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

02.07 فرہنگ

ازمنۂ قدیم	: قدیم زمانہ	قومی یکجہتی	: قومی ایکتا
باطن	: داخل	مترادف	: ہم معنی الفاظ
تصادم	: ٹکراؤ	متروک	: ترک کردہ
رائج	: رواج، چلن	مستعمل	: عام طور پر استعمال میں آنے والا
صرف	: قواعد کی وہ شاخ جو الفاظ کی ساخت اور معنوں پر بحث کرتی ہے	نحو	: قواعد کی وہ شاخ جو جملے میں لفظوں کو جوڑنے، کھولنے اور ان کے باہمی ربط پر بحث کرتی ہے
صوتیات	: آوازوں کا علم	نہج	: راستہ

02.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اُردو کس بولی سے نکلی ہے؟

سوال نمبر۲ : مغربی ہندی کی کتنی بولیاں ہیں؟

سوال نمبر۳ : کیا کھڑی بولی ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : کھڑی بولی کی اِبتدا کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۲ : مغربی ہندی کی بولیوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : چندر بردائی کی نظم ''پرتھوی راج راسو'' کے بارے میں لکھیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : جدید ہند آریائی زبانوں کی دوسری شاخ کا نام کیا ہے؟

(الف) وسطی شاخ (ب) شمال مغربی شاخ (ج) جنوبی شاخ (د) مشرقی شاخ

سوال نمبر۲ : 'خالقِ باری' کیا ہے؟

(الف) منظوم لغت (ب) نظموں کا مجموعہ (ج) حمدیہ نظموں کا مجموعہ (د) پہیلیوں کا مجموعہ

سوال نمبر۳ : مغربی ہندی کس گروہ میں آتی ہے؟

(الف) جنوبی گروہ (ب) شمالی مغربی گروہ (ج) مشرقی شاخ (د) وسطی گروہ

سوال نمبر۴ : گریرسن نے کھڑی بولی بولنے والوں کی کتنی تعداد بتائی ہے؟

(الف) ۵۳/لاکھ (ب) ۶۰/لاکھ (ج) ۶۵/لاکھ (د) ۷۰/لاکھ

سوال نمبر۵ : کھڑی بولی کی قدیم ترین مثال میں کس شاعر کے شعر کا حوالہ دیا گیا ہے؟

(الف) کبیر (ب) جائسی (ج) نام دیو (د) امیر خسرو

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) وسطی شاخ جواب نمبر۲ : (ب) نظموں کا مجموعہ

جواب نمبر۳ : (د) وسطی گروہ جواب نمبر۴ : (الف) ۵۳/لاکھ

جواب نمبر۵ : (ج) نام دیو

02.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی مختصر تنقیدی تاریخ از احتشام حُسین

۲۔ لسانی مطالعے از گیان چند جین

۳۔ مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو از مسعود حُسین خاں

۴۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از محی الدین قادری زور

اکائی 03 : شمالی ہند اور دکن میں اردو ادب کا آغاز

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : شمالی ہند میں اردو شاعری کا ارتقا

03.04 : شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا

03.05 : دکن میں اردو شاعری کا ارتقا

03.06 : دکن میں اردو نثر کا ارتقا

03.07 : خلاصہ

03.08 : فرہنگ

03.09 : نمونہ امتحانی سوالات

03.10 : حوالہ جاتی کتب

03.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

03.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ شمالی ہند اور دکن میں اردو شاعری اور نثر کی ترقی کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ شمال اور دکن کے ان شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہوں گے جنھوں نے اردو شعر وادب کے فروغ اور ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ اردو کی مختلف اصناف، اولین شاعر اور نثر نگار سے متعارف ہوں گے۔

03.02 تمہید

دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہے۔ دکن میں جن دوسرے شعرا نے خاص طور پر نام پیدا کیا ہے ان میں سراجؔ اور نگ آبادی اور ولیؔ دکنی کا نام قابلِ ذِکر ہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہ حاتمؔ، شاہ مبارک آبروؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہ کا شمار ابتدائی شعرا میں ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو نثر کا سوال ہے اس کی ابتدائی ترقی میں صوفیاء کرام نے اہم کردار ادا کیا۔ مخدوم شاہ حسینی کی 'معراج العاشقین' کو اردو کا اوّلین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ مُلّا وجہی کی ''سب رَس'' اردو میں ادبی نثر کا پہلا فن پارہ ہے۔ شمالی ہندوستان میں مولانا فضلی کی 'کربل کتھا' کو اوّلین نثر کا درجہ حاصل ہے۔

03.03 شمالی ہند میں اردو شاعری کا ارتقا

امیر خسرو نے اپنے گیت، غزلیں اور پہیلیاں زبانِ دہلی میں تصنیف کیں۔ اس طرح خسرو وہ پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں جنہوں نے اردو میں ریختہ گوئی کی روایت قائم کی، جس میں کھڑی بولی کی جھلک نظر آتی ہے۔ خسرو سے منسوب یہ اشعار ریختہ میں کھڑی بولی کا روپ واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔

ز حال مسکیں مکن تغافل در آئے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چو زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

مندرجہ بالا اشعار میں اردو زبان کے خدوخال واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جمیل جالبی نے خسرو کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کے کلام کو دیکھ کر دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ اب زبان قدیم اپ بھرنش کے دائرے سے نکل آئی ہے اور دہلی و اطرافِ دہلی کی زبانوں سے مل کر اپنی تشکیل کے ایک نئے دَور میں داخل ہو گئی ہے۔ جس پر کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں اثر انداز ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اب ڈھل منجھ کر اتنی صاف ہو گئی ہے کہ اس میں شاعری کی جا سکے۔''

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی شاعری اپنے ابتدائی مراحل میں دہلی کی اور اطرافِ دہلی کی زبانوں پر مشتمل تھی اور یہ اوّلین ثبوت اس بات کا ہے کہ امیر خسرو کے دَور تک یہ زبان کافی حد تک صاف ستھری ہو چکی تھی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ بعض تحریفات کی وجہ سے امیر خسرو کی شاعری بھی مستند نہیں رہ گئی ہے لیکن پروفیسر مسعود حسین خاں مصنّف ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' کے مطابق ''امیر خسرو کے صاحبِ دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔'' مسعود حسین کی رائے خسرو کے متعلق بالکل درست معلوم ہوتی ہے اور اس بات کا اعتراف بہت سے نام وَر ناقدین اور محققین نے بھی کیا ہے۔ اردو شاعری کے بنیادی اور ابتدائی نقوش خسرو کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ جس سے کسی کو انکار ممکن نہیں ہے۔

امیر خسرو کے بعد ایک طویل عرصے تک شمالی ہند میں شعری خلا پایا جاتا ہے اور کم و بیش تین سو سال کے بعد سترہویں صدی کے اوائل میں ہمیں محمد افضل افضلؔ (وفات ۱۶۲۵ء) کی تخلیق ''بکٹ کہانی'' ملتی ہے۔ اس کتاب میں ادبی شعور اور زبان و بیان کے ساتھ لسانی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مسعود حسین خاں نے ''بکٹ کہانی'' کو شمالی ہند میں اردو کا پہلا نمونہ قرار دیا ہے اور اُسلوبِ شعر کے نقطۂ نظر سے اس عہد کی ریختہ کا مکمّل نمونہ بتایا ہے۔ ''بکٹ کہانی'' ایک بارہ ماسہ ہے جس میں ایک عورت اپنے محبوب کے ہجر میں بے قرار نظر آتی ہے اور وہ اپنے جذبات کا اظہار کس انداز سے کرتی ہے، افضلؔ نے اپنی بکٹ کہانی میں اسی کو نہایت درد انگیز اور سحر انگیز طریقے سے بیان کیا ہے۔ ادبی اعتبار سے اس کتاب کا درجہ بہت بلند ہے اور تاریخی اعتبار سے اس تصنیف کو سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔

بکٹ کہانی کے بعد شمالی ہند کی دوسری اہم تصنیف روشن علی کا ''عاشورہ نامہ'' ہے۔ یہ واقعاتِ کربلا سے متعلّق ایک طویل رزمیہ نظم ہے۔ مسعود حسین خاں نے اس شعری تخلیق کو شمالی ہند کی قدیم ترین ذخیرۂ ادب کا ایک اہم دستاویز قرار دیا ہے۔ اس کتاب کی زبان قصبے کی زبان ہے۔ جس میں ادب کی وہ چاشنی نہیں ہے جو شعری تصانیف کے لئے ضروری قرار دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بعض نقّادوں نے اسے مایوس کن تصنیف قرار دیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں دلّی میں ولّی کی آمد کو شمالی ہند میں اردو شاعری کو باقاعدہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ ولّی کی شاعری سے متاثر ہو کر جن شعرا نے اردو زبان کو اپنے جذبات واحساسات کا وسیلۂ اظہار بنایا ان میں پہلا نام جعفر زٹلی کا ہے۔ جعفر زٹلی نے اربابِ اقتدار پر طنز کے تیکھے وار کیے ہیں اور اپنے عہد کے مسائل کو بڑے اچّھے انداز میں بیان کیا ہے۔ جعفر زٹلی کے ہم عصر فائز دہلوی نے اپنی شاعری کے دَور کی عکّاسی کی ہے۔ ان دونوں کے بعد اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ، سعداللہ گلشنؔ، سراج الدّین علی خاں آرزوؔ اور فغاںؔ جیسے شعرا کا نام ملتا ہے۔ جو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن ولّی کے اثر سے اردو میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جن شعرا نے اردو ادب کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیے، ان میں شاہ مبارک آرزوؔ، شیخ شرف الدّین مضمونؔ، محمد شاکر ناجی کے نام قابلِ ذِکر ہیں۔ علاوہ ازیں ظہور الدین حاتمؔ، مظہر جانِ جاناں اور صدرالدّین محمد خان فائز نے اردو شاعری کی سرپرستی کی۔ ان شعرا کے کلام میں بے ساختگی و روانی کے ساتھ درد و اثر پایا جاتا ہے۔ بعد کو میرؔ و سوداؔ نے اردو شاعری کو بلندی عطا کی۔ میر تقی میرؔ کی تازگی اور سادہ خوب صورت لہجہ آج تک دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ سوداؔ نے قصیدہ کو وقار عطا کیا اور میر حسن نے مثنوی کو زندگی دی۔ اس عہد کے تیسرے بڑے شاعر خواجہ میر دردؔ جو اپنے صوفیانہ کلام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کا دَور عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔ جنہوں نے اردو غزل کو نئی بلندیاں عطا کیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ امیر خسرو نے اپنی گیت، غزلیاں اور پہیلیاں کس زبان میں تصنیف کیں؟

﴿۲﴾ ''بکٹ کہانی'' کس کی تصنیف ہے؟

﴿۳﴾ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز کب سے ہوا؟

03.04 شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا

شمالی ہند میں نثر کا اصلی اور مستقل دَور محمّد شاہ بادشاہ ۱۷۱۹ء/۱۷۴۸ء کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دَور کی سب سے اہم تصنیف اور مربوط تصنیف ''کربل کتھا'' ہے۔ ان سے پہلے میر جعفر زٹلی کے نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مزاحیہ انداز میں ملتے ہیں۔ 'کربل کتھا' دراصل مُلّا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ جسے محرم کی مجلسوں کے لئے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدّین اور شاہ عبدالقادر نے قرآنِ پاک کے ترجمے کیے۔ جس میں عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا۔ ۱۷۷۵ء عطا حسین تحسین نے ''نَوطرزِ مرصّع'' لکھی جو اس دَور کی نمائندہ تصنیف کہی جاسکتی ہے لیکن اس کی نثر مصنوعی اور پُر تکلّف اُسلوب پر مشتمل ہے۔ اردو نثر کی تشکیلِ نو میں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں مترجم کے کام پر مامور میر امّنؔ کی اہمیت بے حد اہم ہے۔ جن کی کتاب ''باغ و بہار'' نے ایک رواں اور بے

تکلّف نثر کو فروغ دیا۔ بعد میں منشی ذکا اللہ، ڈاکٹر اسپنگر، ماسٹر رام چند، پیارے لال آشوبؔ، امام بخش صہبائی وغیرہ نے اردو نثر کو وسعت بخشی اور نیا طرز و آہنگ عطا کیا۔ غالبؔ کے خطوط اور سرسیّد احمد خاں کی نثری کوششوں نے اردو کو سادگی، سلاست اور روانی عطا کی، جسے حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد اور مولانا محمّد حسین آزادؔ نے جدید تقاضوں کے تحت اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کون ہے؟

﴿۵﴾ ولیؔ دکنی دہلی کس سنہ میں آئے؟

﴿۶﴾ کربل کتھا کس مشہور فارسی کتاب کا ترجمہ ہے؟

﴿۷﴾ فورٹ ولیم کالج کب قائم ہوا؟

03.05 دکن میں اردو شاعری کا ارتقا

پندرہویں صدی میں بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ دو اہم ریاستیں قائم ہوئیں۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی اور بیجاپور میں عادل شاہی ریاست وجود میں آئی۔ ان بادشاہوں میں علم و ادب سے گہری دل چسپی تھی۔ لہٰذا ان کے عہد حکومت میں شعر و ادب کو خوب فروغ ملا۔ اردو کی پہلی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' فخر الدّین نظامی نے اسی دور میں لکھی۔ پندرہویں صدی میں دکن کا ایک نام شاہ میراں جی شمس العشّاق کا ہے۔ ان کے علاوہ شاہ برہان الدّین جانمؔ اور امین الدّین اعلیٰ وغیرہ نے نظم اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔

دکن میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ ابتدائی تصانیف شیخ عین الدّین گنج العلم کے مذہبی رسائل کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ جو اُنہوں نے مذہبی احکام سے متعلّق تصنیف کیے تھے۔ اس کے بعد بندہ نواز گیسو دراز کی ''معراج العاشقین، شکار نامہ اور تلاوت الوجود'' نامی تصانیف ابتدائی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات کا تعلّق مذہب و تصوّف سے ہے۔ ان کتابوں میں عربی و فارسی کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

بہمنی حکومت کے زوال کے بعد عادل شاہی حکومت قائم ہوئی۔ اس سلطنت کے کئی فرماں روا خود علم و فضل سے بہرہ ور تھے اور بزرگوں اور صوفیائے کرام کے فیض یافتہ تھے۔ خصوصاً عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ کی فیّاضی اور قدر دانی نے سیکڑوں علما و فضلا، شعرا و اُدبا کو اپنے دربار میں پہنچنے پر مجبور کیا۔ ان شعرا اور ادیبوں کی کوششوں سے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے شعری اور ادبی سرمائے میں کافی اضافہ ہوا۔ عادل شاہی دَور میں جن بزرگ اور عارف باللہ مصنّف نے شہرت حاصل کی وہ شاہ میراں جی شمس العشّاق ہیں۔ ان کی اہم تصنیف ''مرغوب القلوب'' ہے۔ ان کے فرزند برہان الدّین جانمؔ نے بھی اپنی نثری تصنیف اور شعری سرمایہ کے ذریعے اردو ادب کو ثروت مند بنایا۔ ''کلمۃ الحقائق، ہشت مسائل اور ذِکر جلی'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ دیگر بڑے صوفی ادیبوں اور شاعروں میں میراں جی، خدا نما، شاہ محمّد قادری، سیّد میراں حسینی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھوں نے اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی اہم تصنیف ''کتابِ نورس'' کا مقام اردو ادب میں ایک ستون خاص کی اہمیت رکھتی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے صاحبزادے اور عادل شاہ خود صاحبِ ذوق شخصیت کے مالک تھے اور اُنہیں شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی۔ چنانچہ ان کے

دور میں کئی اہم شعرا جمع ہو گئے تھے۔ جن میں رستمی، ملک خوشنود، عبدل اور مقیمی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذِکر ہیں۔ رستمی کی طویل نظم ''خاور نامہ'' اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی تصنیف کے طرز پر ''ہشت بہشت'' لکھی۔ عبدل نے اپنے بادشاہ کی مدح میں ''ابراہیم نامہ'' لکھا۔ ابراہیم نامہ ایک ایسی مثنوی ہے جس میں اس دَور کی پوری زندگی سمٹ آئی ہے اور بیجاپور کی تہذیبی زندگی مصوّر ہو گئی ہے۔ مقیمی نے ''چندر بدن ومہیار'' لکھی۔ ملک الشعرا نصرتی کی شاہ کار تصنیف ''علی نامہ'' ہے۔ جس میں اس نے باشاہ کی فتوحات کا ذِکر کیا ہے۔ اس کی دوسری تصنیف عشقیہ مثنوی ''گلشنِ عشق'' ہے۔ ہاشمی نے اپنی تصنیف ''فسانۂ یوسف زلیخا'' کو منظوم کر کے اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو ثبوت پیش کیا۔

قطب شاہی خاندان کا سب سے بڑا شاعر قلی قطب شاہ (۱۶۱۲-۱۵۲۵ء) ہے۔ جس نے ہر قسم کے موضوعات پر شعر کہے۔ ہندو کلچر کے اثرات اس کی شاعری اور زندگی میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ قطب شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر اور نثر نگار ملا اسد اللہ وجہی ہے۔ جس نے اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ اس دور کا دوسرا بڑا شاعر ابن نشاطی ہے جس نے ایک فارسی قصّے کو اردو میں نظم کر کے مثنوی کی شکل دی اور اس کا نام ''پھول بن'' رکھا۔ دکن کے شاعروں میں ولی (۱۷۲۰-۱۶۵۰ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس نے اردو شاعری کو ترقّی دینے اور پھیلانے میں خصوصی دل چسپی لی۔ اُنہوں نے غزل پر اپنی توجّہ مرکوز کی اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ دکن کے دوسرے علاقوں کے شعرا مثلاً نصرتی، شیخ باجن اور خوب محمّد چشتی وغیرہ نے اردو شاعری کی ترقّی میں حصّہ لیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ پندرہویں صدی میں کون سی دو سلطنتیں وجود میں آئیں؟

﴿۹﴾ ''علی نامہ'' کس کی تصنیف ہے؟

﴿۱۰﴾ قطب شاہی دَور کا دوسرا بڑا شاعر کون ہے؟

03.06 دکن میں اردو نثر کا ارتقا

دکن میں اردو نثر کا آغاز خالص تبلیغی ضرورتوں کے تحت ہوا۔ صوفیاء کرام نے محبت اور انسانی ہم دَردی کے پیغام کو عام کرنے کا وسیلہ نثر کو بنایا۔ دکن کے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ''معراج العاشقین'' اردو کی پہلی تصنیف تصوّر کی جاتی ہے۔

اردو میں تصوّف سے متعلّق بعض رسائل ایسے ملتے ہیں جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ متصوّفین نے متعدّد کتابیں، نظم ونثر میں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں میراں جی شمس العشّاق کے فرزند برہان الدّین جانم اور جانم کے صاحب زادے امین الدّین اعلیٰ وغیرہ نے دکنی نظم ونثر میں جو اہم کارنامے انجام دیئے وہ نہ صرف اپنے فلسفیانہ خیالات کی بنا پر بلکہ ادبی اعتبار سے بھی تاریخ ادب اردو میں جگہ پانے کے لائق ہیں۔ ان کی شاعری کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے یہاں ان کی نثری تصانیف کا جائزہ لیا جائے گا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی دکن کو اوّلیت حاصل رہی ہے۔ جن لوگوں نے نثر کے میدان میں ابتدائی اردو ادب میں پیش رفت کی ان میں میراں جی شمس العشّاق کا نام اوّلیت کا حامل تصوّر کیا جاتا ہے۔ میراں جی شمس العشّاق مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوئے تقریباً ۳۴ رسال عرب وحجاز میں گزار کر ہندوستان آئے اور بیجاپور کو اپنا مرکز بنایا۔ بیجاپور ہی ان کی زندگی اور کمالات کا مرکز تھا۔ اسی جگہ

اُنہوں نے اپنا تبلیغی کام شروع کیا۔ اپنے پیرومرشد کمال بیانی کے حکم سے اُنہوں نے اپنے صوفیانہ خیالات عام ہندوستانی بول چال میں پیش کیے۔

نثر کے میدان میں متعدّد تخلیقات ان سے منسوب ہیں لیکن ان میں سب سے اہم ''شرح مرغوب القلوب'' ہے۔ میراں جی شمس العشّاق نے اپنی زبان کو ہندی کہا۔ ان کے صاحب زادے برہان الدّین جانم نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھایا اور متصوّفین کی روایت کو تقویت اور فروغ دینے میں کافی محنت اور جدوجہد سے کام لیا۔ نثر میں اُنہوں نے ''کلمۃ الحقائق، ہشت مسائل'' اور ''ذِکرِ جلی'' جیسی نابغۂ روزگار کتابیں تصنیف کیں۔ برہان الدّین جانم کے صاحب زادے امین الدّین اعلیٰ کی اہم تصنیف ''گنجِ مخفی'' ہے۔ جس میں کلمۃ الحقائق کے خیالات کی بازگشت موجود ہے۔ اُنہوں نے بھی اپنی زبان کو دکنی اور ہندی کہا ہے۔ نظم ونثر دونوں میں ان کی زبان اپنے بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ رواں اور صاف ہے۔ ان کے شاگردوں میں میراں جی خدانما، محمّد قادری نوردریا، میراں حسینی اور شاہ معظّم نہایت اہم ہیں۔

دکن میں عہدِ بہمنی میں اردو نثر کی ابتدا ہوئی لیکن قطب شاہی دور اس کی ترقّی اور نشوونما کے لئے بیش قیمت ثابت ہوا۔ جب کہ عادل شاہیوں کے دور میں اس کو نمایاں عروج حاصل ہوا۔ شیخ عین الدّین گنج العلم، شمس العشّاق، شاہ میراں جی، برہان الدّین جانم وغیرہ کی نثری کاوشیں اس دور کا طرّۂ امتیاز ہیں۔ اس دور کا نمائندہ ادیب مُلّا وجہی ہے۔ جس کی تصنیف ''سب رَس'' اردو میں ادبی نثر کا اوّلین نمونہ ہے۔ 'سب رَس' ایک تمثیل ہے۔ مطلب یہ کہ چند بے جان چیزوں کو جسم عطا کر کے اُنہیں قصّے، کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ دکن میں سب رس کے بعد نثری تصانیف کا سلسلہ جاری رہا اس دور میں مذہب وتصوّف کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی گئیں۔ ''پنچ تنتر اور ہتوپدیس'' کی کہانیوں کو ''طوطی نامہ'' کے نام سے پیش کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۱﴾ اردو کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

﴿۱۲﴾ قطب شاہی دَور کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟

﴿۱۳﴾ ''پھول بن'' کس کی مثنوی ہے؟

03.07 خلاصہ

اُردو ادب کی ترقّی اور ترویج میں شمالی ہند اور دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے برابر کا حصّہ لیا۔ اردو زبان کی پیدائش دہلی اور آس پاس کے علاقے میں ہوئی۔ جب کہ نثر کی بنیاد صوفیاء کرام نے ڈالی۔ بعد میں ادیبوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ شمالی ہند میں نثر کا سرمایہ زیادہ ہے۔ البتّہ دکن کے شاعروں نے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ابتدائی دَور میں زبان کی سطح پر دونوں علاقوں میں فرق ہے۔ جہاں دکن کے ادب پر علاقائی دکنی اور گجراتی کے اثرات ہیں، وہیں شمالی ہند کے شعروادب پر فارسی کا غلبہ ہے۔

امیر خسرو کے بعد ایک طویل عرصے تک شمالی ہند میں شعری خلا پایا جاتا ہے اور کم وبیش تین سو سال کے بعد سترہویں صدی کے اوائل میں ہمیں محمد افضل افضلؔ (وفات ۱۶۲۵ء) کی تخلیق ''بکٹ کہانی'' ملتی ہے۔ اس کتاب میں ادبی شعور اور زبان وبیان کے ساتھ ساتھ لسانی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مسعود حسین خاں نے بکٹ کہانی کو شمالی ہند میں اردو کا پہلا مستند نمونہ قرار دیا ہے اور اُسلوبِ شعر کے نقطۂ نظر سے

اسے اس عہد کی ریختہ کا مکمّل نمونہ بتایا ہے۔ 'بکٹ کہانی' ایک بارہ ماسہ ہے۔ جس میں ایک عورت اپنے محبوب کے ہجر میں بے قرار نظر آتی ہے اور وہ اپنے جذبات کا ظہار کس انداز سے کرتی ہے، افضلؔ نے اپنی بکٹ کہانی میں اسی کو نہایت درد انگیز اور سحر انگیز طریقے سے بیان کیا ہے۔ ادبی اعتبار سے اس کتاب کا درجہ بہت بلند ہے اور تاریخی اعتبار سے اس تصنیف کو سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔

شمالی ہند میں نثر کا اصلی اور مستقل دور محمّد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی سب سے اہم اور مربوط تصنیف ''کربل کتھا'' ہے۔ ان سے پہلے میر جعفر زٹلی کے نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مزاحیہ انداز میں ملتے ہیں۔ کربل کتھا دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ جسے محرم کی مجلسوں کے لئے فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اس کے بعد شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآنِ پاک کے ترجمے کیے۔ جس میں عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا۔ ۱۷۷۵ء عطا حسین تحسین نے 'نوطرزِ مرصّع' لکھا جو اس دَور کی نمائندہ تصنیف کہی جاسکتی ہے۔

دکن میں تصنیف و تالیف کا باقاعدی آغاز بہنی سلطنت کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ ابتدائی تصانیف شیخ عین الدّین گنج العلم کے مذہبی رسائل کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ جو اُنہوں نے مذہبی احکام سے متعلق تصنیف کیے تھے۔ اس کے بعد بندہ نواز گیسو دراز کی ''معراج العاشقین، شکار نامہ اور تلاوت الوجود' نامی تصانیف ابتدائی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات کا تعلق مذہب و تصوّف سے ہے۔

عادل شاہی دَور میں جن بزرگ اور عارف باللہ مصنّف نے شہرت حاصل کی وہ شاہ میراں جی شمس العشّاق ہیں۔ ان کی اہم تصنیف ''مرغوب القلوب'' ہے۔ ان کے فرزند برہان الدّین جانمؔ نے بھی اپنی نثری تصنیف اور شعری سرمائے کے ذریعے اردو ادب کو ثروت مند بنایا۔ ''کلمۃ الحقائق، ہشت مسائل اور ذِکر جلی' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ دیگر بڑے صوفی ادیبوں اور شاعروں میں میراں جی، خدانما، شاہ محمد قادری، سیّد میراں حسینی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جنہوں نے اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی اہم تصنیف ''کتابِ نورس'' کا مقام اردو ادب میں ایک ستونِ خاص کی اہمیت رکھتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے صاحبزادہ اور عادل شاہ خود صاحبِ ذوق شخصیت کے مالک تھے اور اُنہیں شعر و شاعری سے بھی دل چسپی تھی۔ چنانچہ ان کے دَور میں کئی اہم شعرا جمع ہو گئے تھے۔ جن میں رستمی، ملک خوشنود، عبدل اور مقیمی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذِکر ہیں۔ رستمی کی طویل نظم ''خاور نامہ' اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی تصنیف کے طرز پر ''ہشت بہشت'' لکھی۔ عبدل نے اپنے بادشاہ کی مدح میں ''ابراہیم نامہ' لکھا۔ ابراہیم نامہ ایک ایسی مثنوی ہے جس میں اس دَور کی پوری زندگی سمٹ آئی ہے اور بیجاپور کی تہذیبی زندگی مصوّر ہو گئی ہے۔

دکن میں عہدِ بہمنی میں اردو نثر کی ابتدا ہوئی لیکن قطب شاہی دَور اس کی ترقّی اور نشو و نما کے لئے بیش قیمت ثابت ہوا۔ جب کہ عادل شاہیوں کے دَور میں اس کو نمایاں عروج حاصل ہوا۔ شیخ عین الدّین گنج العلم، شمس العشّاق، شاہ میراں جی، برہان الدّین جانم وغیرہ کی نثری کاوشیں اس دَور کا طرّۂ امتیاز ہیں۔ اس دَور کا نمائندہ ادیب مُلّا وجہی ہے۔ جس کی تصنیف ''سب رَس' اردو میں ادبی نثر کا اوّلین نمونہ ہے۔

03.08 فرہنگ

ارتقا	: ترقّی کرنا، اوپر چڑھنا	قصیدہ	: نظم کی وہ قسم جس میں کسی کی تعریف یا بڑائی
تصنیف	: کتاب		: کی جائے
داغ بیل	: بنیاد	مثنوی	: نظم کی وہ قسم جس میں مسلسل بات بیان کی
دیوان	: شاعر کے کلام کا مجموعہ		جائے۔اس میں ہر شعر کا قافیہ جدا لیکن ہر
صوفی	: متّقی، پرہیز گار		شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں
عہدِ زرّیں	: سنہرہ زمانہ	وسیع	: پھیلا ہوا

03.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : بہمنی اور عادل شاہی دَور کے اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : شمالی ہند اور دکن کے مخصوص شعرا کا تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ولّی کی دلّی آمد کے بعد اردو شاعری پر کیا اثرات مرتّب ہوئے؟ واضح کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دکن میں اردو شاعری کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : شمالی ہند اور دکن کے ادب میں کیا فرق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	از	احتشام حُسین
۲۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل	از	سیّد احتشام حسین
۳۔ مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو	از	مسعود حُسین خاں

03.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ امیر خسرو نے اپنے گیت، غزلیں اور پہلیاں زبان دہلی میں تصنیف کیں۔

﴿۲﴾ محمد افضل

﴿۳﴾ ولی کی آمد کے بعد

﴿۴﴾ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہے۔

﴿۵﴾ ولی دکنی ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے۔

﴿۶﴾ کربل کتھا فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔

﴿۷﴾ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا۔

﴿۸﴾ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں

﴿۹﴾ نصرتی

﴿۱۰﴾ مُلّا اسداللہ وجہی

﴿۱۱﴾ اردو کی پہلی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔

﴿۱۲﴾ قطب شاہی دَور کا سب سے بڑا شاعر مُلّا وجہی ہے

﴿۱۳﴾ پھول بن، ابن نشاطی کی مثنوی ہے۔

اکائی 04 : اردو زبان و ادب کا ابتدائی زمانہ

ساخت

04.01 : اغراض و مقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : اردو زبان کا آغاز
04.04 : اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ
04.05 : اردو زبان کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات
04.06 : اردو ادب کا ابتدائی زمانہ
04.07 : خلاصہ
04.08 : فرہنگ
04.09 : نمونہ امتحانی سوالات
04.10 : حوالہ جاتی کتب
04.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

04.01 اغراض و مقاصد

ہماری اردو زبان کا جنم سرزمین ہند میں ہوا اور یہیں پر یہ پلی بڑھی اور پھولی پھلی۔اس کی تشکیل میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک نے حصہ لیا۔ایک طرف صوفیائے کرام نے اسے اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا تو شعرا و ادبا نے اپنی تخلیقات سے اس زبان کے ادب کو مالا مال کیا۔ اردو زبان و ادب کے ابتدائی زمانے پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور یہ بتایا جائے گا کہ زبان اردو نے اپنے ارتقائی دَور میں کن کن صورتوں کا سامنا کیا اور کس طرح سے ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی آج نکھر کر ایک ایسی زبان بن گئی ہے جو گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار کہلاتی ہے۔اس کے علاوہ ہم اردو کی پیدائش کے تعلق سے پائے جانے والے مختلف نظریات،اس کے فروغ میں صوفیائے کرام کا حصہ نیز دکن اور شمال میں اس زبان کے ادب کا ابتدائی حال بھی بیان کریں گے جس کے مطالعے سے آپ یہ جان جائیں گے کہ اردو زبان و ادب نے اپنے ابتدائی زمانے میں دکن اور شمالی ہند میں کس طرح ترقی کی راہیں ہم وَار کیں۔

04.02 تمہید

زبان کی ارتقا سے متعلق نظریات کا مطالعہ فکر انگیز بھی ہوتا ہے اور دل چسپ بھی۔چوں کہ زبانوں کی نشو ونما انتہائی فطری طور پر ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کسی بھی شعوری کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔اس لئے نشو ونما اور ارتقا کی وجوہات،اسباب اور عوامل کی دریافت کا عمل

انتہائی مشکل بھی ہوتا ہے اور محنت طلب بھی۔ پھر جن اسباب و وجوہات کو ہم کسی زبان کے آغاز وارتقا کے تعلق سے اہم سمجھتے ہیں ان کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی نہیں ہوتی ہے اور سارا معاملہ قیاس پر ہی منحصر ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ ہم زبان کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے اسباب کی تلاش کا کام بند کر دیں کیوں کہ لسانیات کا علم زبان کی ابتدائی صورت حال کا اندازہ کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے اور اس طرح زبان کی ابتدا اور ارتقا کے تعلق سے کوئی نظریہ ضرور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کا آغاز مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہوا۔

04.03 اردو زبان کا آغاز

اردو زبان کی ابتدا تقریباً ایک ہزار عیسوی کے آس پاس شمالی ہندوستان میں ہوئی۔ جب ہم کسی بھی زبان کی ابتدا کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زبانیں ایک یا دو دن میں وجود میں نہیں آتیں اور نہ ہی وجود میں آنے کے بعد فوراً اپنی حیثیت منوالیتی ہیں بلکہ اس کے لئے ایک لمبے عرصے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ جب مختلف زبانوں کے بولنے والے یک جا ہوتے ہیں تو ان کے آپسی تعلقات، لین دین، تجارت اور سماجی سرگرمیاں، تہذیب وثقافت کے مظاہروں اور بول چال سے رفتہ رفتہ ایک نئی زبان پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ہماری اردو زبان کے ساتھ ہوا۔ ہمارے ملک ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ زبانیں دراصل تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں۔ اردو زبان کے لئے بھی سرزمینِ ہند کی مٹی بڑی سازگار ثابت ہوئی۔

جب ابتدا میں مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔ یہاں اُنہوں نے اہلِ ہند کے ساتھ اپنے تعلقات تاجرانہ حیثیت سے، سماجی حیثیت سے، ثقافتی حیثیت سے اور روزمرّہ کے معاملات حل کرنے کے لئے استوار کیے۔ ان میں عرب، ایرانی، افغانی، ترک اور مغل شامل تھے جو اپنے ساتھ اپنی زبان کے علاوہ اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی قدریں بھی ساتھ لائے تھے۔ جب ان میں اور ہندوستان میں رہنے والے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ مقامی بولیوں کا سہارا لیا۔ اس طرح ایک نئی زبان کا وجود عمل میں آیا۔ آج ہم جس روانی کے ساتھ اپنی زبان اردو کا استعمال کرتے ہیں وہ زمانے کے نشیب وفراز اور مختلف مراحل سے گزر کر اس مقام پر پہنچی ہے کہ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کریں۔

اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی جائے پیدائش سرزمینِ ہند اور اس کا سلسلہ جدید ہند آریائی زبانوں سے ملتا ہے۔ یہ اس زبان کی خوبی ہے کہ اس نے بہت قلیل مدّت میں اپنی سادگی، سلاست، روانی، برجستگی، مٹھاس اور حُسن سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ کر لیا اور بہت ہی جلد ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک راج کرنے لگی۔

یہ بھی ایک دل چسپ بات ہے کہ ہماری زبان اردو کو اس کے ابتدائی وتشکیلی دَور میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ دکن میں اسے ''دکنی'' کہا گیا تو گجرات میں ''گجری'' کہہ کر بلائی گئی۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ''ہندی اور ہندوی'' کا نام دیا۔ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب نے اسے ''اردوئے معلّٰی'' کہا۔ کبھی اسے ''زبانِ دہلوی'' کا نام ملا تو کبھی ''ہندوستانی'' اور کبھی ''ریختہ'' کے نام سے پہچانی گئی۔ بالآخر مختلف نشیب وفراز سے گذرتی اور اپنی مختلف شناخت بناتی ہوئی یہ زبان ''اردو'' کہلائی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ اردو زبان کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی ؟

﴿۲﴾ مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان میں کون سی زبانیں لائے تھے؟

﴿۳﴾ اردو کے مختلف نام کون کون سے ہیں؟

04.04 اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اردو زبان کے ابتدائی دور میں اسے صوفیائے کرام کا بڑ سہارا ملا۔ ہر چند کہ صوفیاء کرام کو اردو زبان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی اس زبان کو ترقی دینا ان کا مقصد تھا۔ ان صوفیائے کرام کی زبان فارسی اور عربی تھی لہٰذا ان زبانوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام ہندوستان میں ان کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اور اس وقت اردو زبان ملک میں ایک حصے سے دوسرے حصے تک بولی اور سمجھی جانے لگی تھی اور اس زبان کی دل نشینی اور مٹھاس ہر خاص و عام کو اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔ اس زبان کو بولنے اور لکھنے کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ اسی لئے صوفیائے کرام نے ترقی کے مدارج طے کرتی اردو زبان کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا۔ صوفیائے کرام کے اس عمل سے اردو زبان پند و نصیحت، اخلاقی اقدار اور رشد و ہدایت کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی جس کی بنا پر اس زبان میں اظہار کی ندرت پیدا ہوتی گئی۔ صوفیائے کرام کی سرپرستی میں اردو کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ جن صوفیائے کرام نے اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم خدمات انجام دیں۔ ذیل میں ان کے نام اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

شمار نمبر	صوفیائے کرام	سنہ وصال	تصانیف/خدمات
﴿۱﴾	حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ	1235ء	ان کی کوئی تصنیف بامعتبر قول، ہندی زبان میں نہیں ملتا۔ آپ نے اجمیر میں تبلیغِ اسلام کا ایک مستقل نظام قائم کیا۔
﴿۲﴾	بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ	1265ء	آپ کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب ''گروگرنتھ صاحب'' میں ملتا ہے۔
﴿۳﴾	قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ	1274ء	آپ کے بہت سارے مذہبی رسالے ہیں۔
﴿۴﴾	حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ	1324ء	خالق باری (بچوں کا ادب)، نظمیں، دوہے پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ۔
﴿۵﴾	شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ	1370ء	پوربی اور ہندی زبان کے شاعر تھے۔
﴿۶﴾	شیخ عین الدین گنج العلم رحمۃ اللہ علیہ	1392ء	دکنی زبان میں کئی مذہبی رسالے لکھے۔
﴿۷﴾	خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ	1422ء	معراج العاشقین، ہدایت نامہ، شکار نامہ، تلاوت الوجود، تمثیل نامہ
﴿۸﴾	شاہ میراں جی شمس العشاق رحمۃ اللہ علیہ	1496ء	خوش نامہ، شہادت الحقیقت، شرح مرغوب القلوب

﴿۹﴾ شیخ بہاءالدین باجن رحمۃ اللہ علیہ 1506ء خزائن رحمت (تصوف کے شاعر تھے)

﴿۱۰﴾ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ 1538ء رشدنامہ (ہندی میں شعر کہتے تھے)

﴿۱۱﴾ شاہ محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ 1563ء جواہر خمسہ' آپ کے ہندی قول اور ہندی اشعار قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں'

﴿۱۲﴾ شاہ علی محمد جیو گام دہنی رحمۃ اللہ علیہ 1565ء جواہر اسرار الحق

﴿۱۳﴾ شیخ وجیہہ الدین احمد علوی رحمۃ اللہ علیہ 1589ء بحر الحقائق

﴿۱۴﴾ شاہ برہان الدین جانم رحمۃ اللہ علیہ 1598ء ارشادنامہ، عبرت آدم، کلمۃ الحقائق

﴿۱۵﴾ شیخ خوب محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ 1622ء خوب ترنگ، بھاؤ بھید

﴿۱۶﴾ میراں جی خدانما رحمۃ اللہ علیہ 1663ء رسالہ وجودیہ، شرح تمہیدات عین القضات

﴿۱۷﴾ شاہ امین الدین اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ 1675ء گنج مخفی، عشق نامہ، ظاہر و باطن، گفتار امین الدین

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ صوفیائے کرام نے اردو زبان کی سرپرستی کیوں کی؟

﴿۵﴾ ''خالق باری'' کس کی تصنیف ہے اور یہ کیا ہے؟

﴿۶﴾ تین صوفیائے کرام کے نام اور ان کی تخلیقات کے نام لکھیے۔

04.05 اُردو زبان کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریات

اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے ہمیں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ جن حضرات نے اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے اپنی تحقیق کے ذریعہ اردو کی جائے پیدائش ثابت کرنی کی کوشش کی ہے، ان میں محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر محمد حسین خاں اور نصیر الدین ہاشمی کے نام اہم ہیں۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالہ سے ابتدا میں اکثر ایسے افراد نے بحث کی ہے جن کا لسانیات کے علم سے گہرا تعلق نہ تھا۔ ان حضرات میں انشاء اللہ خان اِنشا، میر امن دہلوی، امام بخش صہبائی، مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی کے نام ملتے ہیں۔

انشاء اللہ خان اِنشا نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا کا مجموعہ کہا تو میر امن دہلوی نے اسے مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے جب کہ امام بخش صہبائی نے رسالہ ''قواعد اردو'' میں یہ لکھا ہے کہ شاہ جہاں آباد (دلّی) میں فارسی اور ہندی کے میل جول سے جو زبان رائج ہوئی اس کا نام اردو قرار پایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں آٹھویں، نویں اور گیارہویں صدی کی زبان کے نمونے سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ بزرگان دین نے ہندوستانی عوام سے اپنا تعلق قائم کرنے اور ان تک اپنی باتیں پہنچانے کے لئے ان کی اور اپنی زبانوں کو ملانا شروع کیا۔ ان کے اس عمل سے ایک نئی زبان وجود میں

آئی جو ایک مخلوط زبان تھی جس کا نام اردو یا ہندوستانی پڑا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''نقوشِ سلیمانی'' کے ایک مضمون میں یہ لکھا ہے کہ اردو کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا مگر مولانا نے بعد میں جو مضامین لکھے ان میں میر امن کے خیال کے حامی نظر آئے کہ اردو مختلف زبانوں اور قوموں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔

محمد حسین آزاد نے اپنی لازوال تصنیف ''آبِ حیات'' میں یہ دعویٰ پیش کیا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں اردو کا تعلق پنجابی زبان سے جوڑتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے سندھ اور پنجاب میں سکونت اختیار کی اور وہاں اُنہوں نے سرکاری، کاروباری اور سماجی تعلق بنائے رکھنے کے لئے کسی نہ کسی ہندوستانی زبان کا سہارا ضرور لیا ہوگا اور اس کے اس میل جول سے جو زبان وجود میں آئی وہ اس زبان کو دلّی لے آئے۔ یہ زبانیں پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی رہی ہوگی۔ دہلی میں اس زبان کا تعلق برج اور دوسری زبانوں سے ہوا۔ اس طرح دن رات کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئی اس کا نام بعد میں اردو پڑا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں یہ واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا صدر مقام برسہا برس تک آگرہ اور دہلی رہا ہے۔ اس لئے اردو زبان کھڑی بولی سے زیادہ متاثر ہے۔ پروفیسر نصیر الدین ہاشمی اپنی تحقیق ''دکن میں اردو'' میں اردو کا سرچشمہ پراکرت زبان کو مانتے ہیں اور وہ اس لئے کہ مسلمان جب ہندوستان آئے تو اس وقت پیشاور سے لے کر الٰہ آباد تک یہی زبان بولی جاتی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب ''داستانِ زبان اردو'' میں کہتے ہیں کہ سنسکرت، پالی، شورسینی، مراٹھی، اپ بھرنش ایک زبان کی کئی شکلیں ہیں اور یہ زبان دوآبہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی جس سے سج سنور کر یہ زبانیں بنیں۔ اسی بنا پر شوکت سبزواری اردو کو اپ بھرنش کے روپ سے ماخوذ کرتے ہیں۔

لسانی تحقیق میں ایک اہم محترم نام مسعود حسین خاں کا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق تحقیق ''مقدمۂ تاریخِ زبان اردو'' ہے جس میں موصوف نے مدلل انداز میں اردو زبان اور اس کے آغاز کے حوالے سے سیر حال بحث کرتے ہوئے ہریانوی زبان پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہریانی کو ہمارے محققین نے یکساں طور پر نظر انداز کیا ہے جب کہ یہی وہ زبان ہے جو قطعِ نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنے نظریے کے حوالے سے یہ رائے دی ہے کہ اردو برج، ہریانوی اور کھڑی بولی کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کے مختلف نظریات اور حوالے کو روشنی میں جو باتیں اور نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں۔

﴿۱﴾ اردو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔
﴿۲﴾ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔
﴿۳﴾ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی ہے۔
﴿۴﴾ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی ہے۔
﴿۵﴾ اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔
﴿۶﴾ اردو کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ اردو کے آغاز کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا نظریہ کیا ہے؟
﴿۸﴾ اردو کے تعلق سے جن لوگوں نے نظریے پیش کیے، ان میں سے کن کا تعلق علم لسانیات سے نہیں تھا؟
﴿۹﴾ اردو کے تعلق سے مسعود حسین خاں نے کیا نظریہ پیش کیا ہے؟

04.06 اردو ادب کا ابتدائی زمانہ

اردو کے ابتدائی زمانے کے تعلق سے ہمیں اپنے مطالعے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ یعنی اردو ادب دکن میں اور اردو ادب شمال میں کیوں کہ یہی دو علاقے وہ ہیں کہ جہاں اردو ادب کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔

﴿۱﴾ اردو ادب دکن میں

عزیز طلبا! ہم نے پچھلے صفحات میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری زبان اردو کس طرح وجود میں آئی اور اس کی ابتدا کے حوالے سے کیا نظریے قائم کیے گئے۔ نیز صوفیائے کرام حضرات نے کس طرح اس زبان کی سرپرستی کی۔ ہم اب یہاں اردو کے ابتدائی زمانے سے تفصیلی بحث کریں گے تا کہ آپ یہ جان سکیں کہ اردو زبان میں ابتدائی ادب کے خدوخال کیا رہے اور وہ کون با کمال حضرات تھے جنہوں نے اردو ادب کی تخلیق و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

اردو ادب کے ابتدائی دَور کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر چند اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا لیکن اس سے قبل ہمیں دکن میں اس کے واضح خدوخال نظر آتے ہیں۔ دکن میں ہمیں اردو ادب کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں وہ زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں اور یہ فقرے، جملے، اقوال صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے ہیں اور ان ہی سے اردو ادب کے ابتدائی دَور کا سراغ ملتا ہے۔

۱۴ ویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اردو زبان اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکی تھی اور دکن کے مختلف حصوں میں جلال الدین خلجی کے دَورِ اقتدار میں یہاں کے لوگ اردو سے آشنا ہو چکے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان کے اوّلین نمونے ہمیں شمالی ہند میں نظر آتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں باضابطہ طور پر کتابیں نہیں لکھی گئیں لیکن یہی اردو زبان جب دکن پہنچتی ہے اور محمد بن تغلق دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بناتا ہے تو یہاں نہ صرف اردو کے لئے فضا بے حد سازگار ہو جاتی ہے بلکہ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع ہو جاتا ہے اور ادب کی بھی تخلیق ہوتی ہے۔

اردو ادب کے اس قدیم دَور کو ہم با آسانی چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

﴿۱﴾ بہمنی دَور	1525-1350ء
﴿۲﴾ عادل شاہی دَور	1686-1490ء
﴿۳﴾ قطب شاہی دَور	1687-1508ء
﴿۴﴾ زوالِ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کا زمانہ	1750-1686ء

﴿۱﴾ بہمنی دَور (1350-1525ء)

۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کے نام سے ایک خود مختار حکومت بنی جس کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا۔ اس کے عہد میں اردو ادب کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ دکن میں آنے والے صوفیائے کرام کی بہمنی سلاطین نے قدر و منزلت کی۔ ان بزرگانِ دین کی وجہ سے یہاں اردو کی ترقی کی راہیں ہم وَار ہونے لگیں۔ اس عہد میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور دیگر دوسرے صوفیاء کی ادبی کوششوں کے ابتدائی

نمونے ملتے ہیں اس دَور کے اہم شعرا و مصنّفین میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، فخر دین نظامی، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، قطب الدین قادری اور فیروز کے نام اہم مانے جاتے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے دکن کے گلبرگہ میں سکونت اختیار کی اور یہاں آپ نے رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ آپ کا درس فارسی کے علاوہ اردو میں بھی ہوتا تھا۔ ''معراج العاشقین'' کو ابتدا میں آپ کے نام سے منسوب کیا گیا لیکن نئی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ عادل شاہی دَور کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسین کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ شکار نامہ، تمثیل نامہ، خلاصۂ توحید اور چکی نامہ بھی خواجہ صاحب کے نام سے منسوب ہیں۔ فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو نہ صرف اردو کی قدیم مثنوی ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ یہ دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔ میراں جی شمس العشاق اس دَور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں: (1) خوش نامہ (2) خوش مغز (3) شہادت التحقیق (4) مغزِ مرغوب۔ سید شاہ اشرف بیابانی کا ذکر باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ میراں جی شمس العشاق کے ہم عصر بھی ہیں۔ آپ نے ایک مثنوی ''نوسرہار'' کے نام سے لکھی جسے بے حد مقبولیت ملی، اس کے علاوہ وہ مذہبی مسائل پر بھی ایک نظم ''لازم المبتدی'' لکھی۔ قطب الدین قادری فیروز اس دَور کے ایک باکمال سخنور ہیں۔ ان کی ایک مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ کچھ غزلیں بھی ملتی ہیں۔ اس عہد دیگر شعرا میں قریشی بیدری کی جنسیات کے موضوع پر ایک مثنوی ''بھوگ بل'' ملتی ہے جب کہ مشتاق اور لطفی کی چند غزلیں اور قصائد بھی ملتے ہیں۔

﴿۲﴾ عادل شاہی دَور (1490-1686ء)

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ دکن میں عادل شاہی دَور کے سلاطین نے نہ صرف شعر و ادب کے ارتقا میں نمایاں حصہ لیا بلکہ مقامی تہذیب و روایت اور اقدار کی ترویج و اشاعت کا کام بھی کیا۔ اس عہد میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ کے علاوہ نثر نگاری نے بھی ترقی کی لیکن عادل شاہی عہد میں جب ہم اردو ادب کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں نثر کے مقابلے میں شاعری کا چلن زیادہ رہا ہے۔ اس عہد کے سلاطین علم و ادب سے عقیدت رکھتے تھے جن میں حسن شوقی ملک الشعرا نصرتی، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور ہاشمی بیجاپوری کے نام نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ حسن شوقی مثنوی نگار اور غزل گو کی حیثیت سے مقبولیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک دیوان ملتا ہے اور دو مثنویاں۔ ان کی پہلی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' ہے جس میں ۱۶۲۰/اشعار ہیں جب کہ دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' ہے جو ۱۲۱۴/اشعار پر مشتمل ہے۔ محمد نصرت نصرتی کا شمار عادل شاہی کے عظیم شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی ۳/مثنویاں ہیں: (۱) گلشنِ عشق (۲) علی نامہ (۳) تاریخ اسکندری، اس کے علاوہ غزل، قصیدہ اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی موجود ہے۔ نصرتی کو قصیدہ کے حوالے سے دکن کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی کو بچپن سے ہی علم و ادب کا بے حد شوق تھا اور اس نے شاعری کی کم و بیش تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاہی کی کلیات میں غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں کے علاوہ گیت بھی ملتے ہیں۔ ہاشمی بیجاپوری کا شمار عادل شاہی عہد کے آخری دَور کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہاشمی پیدائشی طور پر بصارت سے محروم تھا لیکن بعض جگہوں میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ چیچک کے مرض کے سبب ہاشمی کی بینائی جاتی رہی۔ ہاشمی کی تصانیف میں دیوانِ غزلیات کے علاوہ دو مثنویاں ملتی ہیں جن میں ''یوسف و زلیخا'' اہم مثنوی ہے اس مثنوی میں ۵۱۲۸/اشعار ہیں۔ دوسری مثنوی عشقیہ ہے۔ ہاشمی کی مثنوی کے علاوہ قصیدہ گوئی اور غزل گوئی پر بھی قدرت تھی۔

اوپر جن شعرا کا ذکر آیا یہ وہ اہم نام ہیں جنہوں نے عادل شاہی عہد میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ ان کے علاوہ دیگر قابلِ ذکر شعرا میں جانم، عبدل، مقیمی، رستمی، علی رحمتی، ایاغی، صنعتی، عاجز، امین الدین علی اعلیٰ، معظم بیجاپوری اور مخدوم شاہ حسینی کے نام اہم ہیں۔

اس مختصر سے جائزہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عادل شاہی دَور دکنی ادب کا وہ سنہرا دَور تھا جس میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی پرورش و پرداخت کا کام بھی منظّم طریقے سے انجام پایا اور یہاں نثر کا پہلا رسالہ ''کلمۃ الحقائق'' برہان الدین جانم نے لکھا۔

﴿۳﴾ قطب شاہی دَور (1508-1687ء)

قطب شاہی دَور کو دکن میں اردو شعر و ادب کی ترقی کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دَور میں اردو ادب کے فروغ کی تمام کوششیں کی گئیں۔ اس عہد کے ممتاز و مقبول شعرا و اُدبا میں اسد اللہ وجہی، محمد قلی قطب شاہ، غوّاصی اور ابن نشاطی کے نام اہم ہیں۔

وجہی صرف ایک ممتاز شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی تھا۔ شاعری میں وجہی کا لازوال کارنامہ ''قطب مشتری'' ہے جو ۱۰۱۸ھ میں لکھی گئی اور نثر میں ان کا اہم کارنامہ ''سب رَس'' ہے جو قدیم طرز کی ایک داستان ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے یوں تو اُنہوں نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور مثنوی پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ان کی محبوب صنفِ سخن رہی ہے۔

قلی قطب شاہ کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ غواصی قطب شاہی عہد کا ایک نام وَر اور بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی چار مثنویوں (۱) مینا ستونتی (۲) سیف الملوک و بدیع الجمال (۳) طوطی نامہ (۴) طریقت کے علاوہ نظموں، قصائد و مراثی اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی موجود ہے۔ غواصی کی مثنویاں دکنی عہد کی شاہ کار مثنویاں کہلاتی ہیں۔ ابن نشاطی بھی قطب شاہی دَور کا مشہور و مقبول شاعر ہے۔ نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' کا شمار اہم مثنویوں میں ہوتا ہے یہ مثنوی ۱۷۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔

﴿۴﴾ زوال گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کا زمانہ (1686-1750ء)

عادل شاہی حکومت کے علاوہ دکن میں دبستانِ بیجاپور اور دبستانِ گول کنڈہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۷ویں صدی عیسوی میں ان دبستانوں کے زیر اثر تخلیق پانے والے ادب میں مقامی تہذیبی عناصر کی جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں۔ یہاں جن لوگوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت کا بیڑا اپنے کاندھوں پر اُٹھایا ان میں ولّی محمد اورنگ آبادی اور سراجؔ اورنگ آبادی کو عظیم مقام حاصل ہے کیوں کہ یہ دونوں صاحبِ کمال دکنی شاعری کی عظیم روایت کے آخری تاجدار مانے جاتے ہیں۔ ان ہی حضرات نے شمالی ہند کے شعرا کو اردو زبان میں شعر گوئی کی طرف مائل کیا اور جب ۱۷۱۹ء میں ولّی کا دیوان دہلی پہنچا تو ہر خاص و عام کی زبان پر ولّی کے شعر جاری ہو گئے۔ ولّی کے دیوان میں مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ اور مخمس وغیرہ تمام اصنافِ سخن موجود ہیں لیکن ولّی کی شہرت و مقبولیت کا اصل سبب ان کی غزل گوئی ہے۔ ولّی نے اپنی شاعری ذریعہ دکن کی شعری روایت اور رجحانات کی آبیاری کی ہے۔

ولّی کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی اردو کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے تقریباً تمام شعری اصناف میں اپنے نقوش قائم کیے ہیں۔ ان کے کلیات میں غزل، قصیدہ مرثیہ مثنوی اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی محور عشق ہے۔ یوں تو سراجؔ نے ۱۲ مثنوی

لکھی ہیں لیکن ان میں ''بوستانِ خیال''، اہم ترین ہے جس میں ۱۱۶۰ اشعار ہیں۔ اس دَور کے دیگر شعرا میں قاضی محمود بحری، سید محمد فراقی، داؤد اورنگ آبادی، فدوی اورنگ آبادی، وجدی، ضعیفی، ذوقی، ولی، ویلوری، شاہ تراب، اور عشرتی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

﴿۲﴾ شمالی ہند میں اردو نثر

جب ہم شمالی ہند میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں شاعری کے ساتھ نثر کا کام بھی ہوا۔ ''فضل علی خان فضلی'' کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا نمونہ ہے جو مُلّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے جس کا موضوع واقعات کربلا ہے۔ شمالی ہند میں لکھی جانے والی پہلی نظری داستان عیسیٰ خان بہادر کا ''قصہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔ اس کی زبان پر کھڑی بولی کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔ اسے ہم شمالی ہند کی قدیم نثر کا ایک نمونہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے ''نوطرزِ مرصع'' لکھی جس میں اردو نثر کو فارسی کے اُسلوب اور رنگ سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جب کہ مہر چند کھتری نے ''نو آئینِ ہندی'' لکھی تو اس کی نثر سادہ اور عام فہم رکھی جس میں روزمرہ کی بول چال کے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل سادہ اور رواں نثر کی روایت کا اولین نمونہ ہے۔ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے سادہ اور عام فہم زبان میں ''عجائب القصص'' نام کی داستان لکھی جس کے مطالعے سے ہمیں اس دَور کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ سید شاہ حسین حقیقت نے میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کی کہانی سے ملتی جلتی ایک داستان ''جذبۂ عشق'' کے نام سے لکھی۔ سید عبدالولی عزلت اردو کے وہ اوّلین شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا۔

اردو نثر کے ارتقائی سفر میں قرآن مجید کے اردو تراجم بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ چوں کہ ان کی وجہ سے اردو نثر میں علمی مسائل کے اظہار میں قوت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں شاہ محمد رفیع الدین، شاہ مراد اللہ انصاری اور شاہ عبدالقادر کے نام اہم ہیں۔ اُنہوں نے قرآن کے تراجم و تفاسیر سے اردو کے فروغ میں حصہ لیا۔ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب ۱۸۰۰ء میں شہر کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ اس میں ہندوستانی زبانوں کے شعبہ کے سربراہ مقرّر ہوئے۔ اس کالج کے توسط سے گل کرسٹ کی سربراہی میں اردو نثر کو زبردست عروج حاصل ہوا اور اسی کالج میں گل کرسٹ کی ایما پر میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' جیسی لازوال کتاب پیش کر کے اردو نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہمیں دکھایا جسے اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ دکن میں اردو ادب کو کتنے اَدوار میں تقسیم کر سکتے ہیں؟

﴿۱۱﴾ ''کدم راؤ پدم راؤ'' کس کی تخلیق ہے اور کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ ولی کا دیوان دہلی کب پہنچا؟

﴿۱۳﴾ ولی کی دہلی آمد سے پہلے اردو میں شعر کہنے والے شعرا کے نام بتایئے۔

﴿۱۴﴾ دبستانِ دہلی کے تین اہم شعرا کے نام لکھیے۔

﴿۱۵﴾ دبستانِ لکھنؤ کے تین اہم شعرا کے نام لکھیے۔

﴿۳﴾ شمالی ہند میں اردو شاعری

اُردو شعر و ادب کو اپنے ابتدائی ایام میں سرزمینِ دکن میں فروغ پانے کے لئے بہت سے سہارے ملے۔ دکن کے بعد شمالی ہندوستان میں دہلی اردو ادب کے ایک مضبوط مرکز کی حیثیت سے اُبھری اور یہاں اردو زبان و ادب کے لئے ایسا خوش گوار ماحول بن گیا کہ شمالی ہند کے وہ شعرا و اُدبا بھی جو اس سے قبل فارسی میں شعر کہتے تھے، اردو کی طرف مائل ہونے لگے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل یہاں اردو شعر گوئی کا رواج نہ تھا۔ ولؔی کی آمد سے قبل جو شعرا کبھی کبھار اردو میں شعر کہتے تھے ان میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ، ٹیک چند بہارؔ اور جعفر زٹلی کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جو فارسی زبان میں اپنی شاعری کا اعتراف کروا چکے تھے۔

یہ دَور وہ دَور ہے جسے ہم مغلیہ سلطنت کے انتشار اور زوال کا عہد کہتے ہیں۔ اس وقت یہاں سرکاری زبان فارسی تھی اور ہندی زبان کی حیثیت محض ایک بولی تھی لہٰذا قدرتی طور اردو میں فارسی اور ہندی کے الفاظ دخیل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہاں اردو شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تو ایرانی شاعری کی تمام شعری خصوصیات یعنی تصنع، تصویر پرستی اور مشکل پسندی اردو شاعری میں بھی در آئیں۔ شمالی ہند میں اردو میں شعر گوئی کا رواج اس وقت زیادہ فروغ پایا جب ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا اور اس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی۔ اس کا اثر دہلی کی شاعری پر یہ پڑا کہ شمالی ہند میں شعر گوئی کا آغاز ان شعرا کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے ولؔی کی پیروی میں ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ یہاں ولؔی سے متاثر ہو کر جن شعرا نے اردو میں شعر کہے ان میں حاتمؔ، آبروؔ، شاکرؔ، ناجیؔ فغاںؔ، فائزؔ اور یک رنگؔ کے نام شامل ہیں۔

ولؔی کی شمالی ہند میں آمد اردو شعر و ادب کے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ ولؔی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے دکنی اور شمالی ہند کی زبانوں کو ملا کر ایک ایسی خوش نما ادبی شکل عطا کی جس کو دکن اور شمال کے لوگوں نے دل سے قبول کیا۔ ولؔی کے اس اثر کا کھلے دل سے اعتراف اس دَور کے بیش تر شعرا نے کیا ہے۔

مثلاً داؤد کہتے ہیں ؎

علی کی ہے قسم سن شعر تیرا کہے عالم ولی ثانی نہیں ہے

آبروؔ کہتے ہیں ؎

آبرو شعر ہے تیرا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ہے

حاتم نے کچھ یوں لکھا ؎

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولؔی، ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

ولؔی کی ان ہی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر ان کے ہم عصر شعرا نے جہاں اُنہیں اعلیٰ درجہ کا شاعر کہا وہیں خدائے سخن میر تقی میرؔ نے اُنہیں ریختہ کا مسلم الثبوت استاد کہا۔ جب کہ محمد حسین آزادؔ اُنہیں اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ ولؔی کے اثر سے شمالی ہند میں اردو شاعری مختلف مراکز میں ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ ان میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کو اردو شاعری کے فروغ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

دبستانِ دہلی اردو کا ایک اہم دبستان ہے جس سے وابستہ شعرا کے یہاں ہمیں داخلیت، سنجیدگی اور احساسات و کیفیات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ان شعرا کے یہاں اپنے عہد کی تباہ حال دہلی کی زندہ تصاویر بھی ملتی ہیں۔میرؔ کی شاعری میں ان باتوں کا بین ثبوت موجود ہے۔ دبستان دہلی کی دوسری نمایاں خصوصیات تصوّف اور اظہار کی روانی ہے۔دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کے یہاں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

﴿۱﴾ اظہارِ بیان میں سادگی اور سلاست

﴿۲﴾ کلامِ بیان میں ہر جگہ برجستگی

﴿۳﴾ معاملات اور واقعات حقیقی

﴿۴﴾ ابتذال سے پرہیز

﴿۵﴾ آمد کی کیفیت کی کلام میں موجودگی

﴿۶﴾ مختصر غزلیں سہلِ ممتنع کی شکل میں

﴿۷﴾ اخلاقیات کا غالب رنگ

یہ خوبیاں ہیں جنہیں دبستانِ دہلی کے شعرا کی نمایاں خصوصیات کہہ سکتے ہیں۔

دبستانِ دہلی کے شعرا میں جن کو نمایاں عظمت حاصل ہوئی، ان میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، مظہرؔ جانِ جاناں، عبدالحی تاباںؔ، میر حسنؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، میر مہدی مجروحؔ، ذکیؔ، رخشاںؔ، نیرؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

دبستانِ دہلی کی طرح دبستانِ لکھنؤ میں بھی غزل کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔اس کے علاوہ مثنوی اور مرثیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ میر حسن نے جہاں مثنوی کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا وہیں انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیے کو اپنی انتہا کو پہنچادیا۔مرثیے ابتدا میں ہر چند کہ دکن میں لکھے گئے لیکن اس صنفِ شاعری کو لکھنؤ میں جو ترقی ملی وہ قابلِ فخر ہے۔ضمیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، تعشقؔ، مونسؔ اور انسؔ ایسے باکمال مرثیہ گو ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔دبستانِ لکھنؤ کے یوں تو بہت سے شعرا ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے دامن کو غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت اور ریختی سے سرفراز کیا۔ان میں اہم اور قابلِ ذکر شعرا کے حوالے سے شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاءاللہ خان انشاؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، میر ببر علی انیسؔ، مرزا سلامت علی دبیرؔ، حکیم تصدق حسین خان اور مرزا شوقؔ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

04.07 خلاصہ

اُردو زبان کی ابتدا تقریباً ایک ہزار عیسوی کے آس پاس کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں ہوئی۔ جب ابتدا میں مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔یہاں اُنہوں نے اہلِ ہند کے ساتھ اپنے تعلقات تاجرانہ حیثیت سے، ثقافتی حیثیت سے اور روزمرہ کے معاملات حل کرنے کے لئے استوار کیے۔جب ان میں اور ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے درمیان تعلقات کی راہیں مزید ہموَار ہوئیں تو اُنہوں نے اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے کچھ اپنے الفاظ اور کچھ مقامی بولیوں کا سہارا لیا۔اس طرح ایک نئی زبان کا وجود عمل میں آیا۔زبانِ اردو کو اس کے ابتدائی و تشکیلی دَور میں مختلف ناموں مثلاً دکنی، گجری، ہندی، ہندوی، اردوئے

معلیٰ، ہندوستانی اور ریختہ وغیرہ سے بھی پہچانا گیا۔ اردو زبان کے ابتدائی دَور میں اسے صوفیائے کرام کا بڑا سہارا ملا۔ چوں کہ یہ اس وقت تک عوام میں بحیثیتِ بولی کے مقبول ہو چکی تھی اس لئے صوفیاء کرام نے ترقی کے مدارج طے کرتی اردو زبان کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا۔

اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے مختلف نظریات قائم کیے، جن میں محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر مسعود حسین خاں، نصیر الدین ہاشمی کے نام اہم ہیں۔ دکن میں اردو ادب کے اس قدیم دَور کو بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی، زوالِ گول کنڈہ اور بیجاپور کے بعد کے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

دکن کے بعد شمالی ہندوستان میں دہلی اردو ادب کے ایک مضبوط مرکز کی حیثیت سے اُبھری اور یہاں اردو زبان و ادب کے لئے ایک خوش گوار ماحول بن گیا ہر چند کہ اس وقت یہاں سرکاری زبان فارسی تھی اور ہندی زبان کی حیثیت محض ایک بولی کی تھی۔ دراصل شمالی ہند میں اردو میں شعر گوئی کا رواج اس وقت زیادہ فروغ پایا جب ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا اور اس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی۔ اس کے بعد سے شمالی ہند میں اردو شاعری مختلف مراکز پر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ بعد میں شمالی ہند میں دہلی اور لکھنؤ زبانِ اردو کے دو اہم دبستان کے طور پر اُبھرے۔

دبستانِ دہلی اردو کا ایک اہم دبستان ہے جس سے وابستہ شعرا کے یہاں داخلیت، سنجیدگی اور احساسات و کیفیات کا برملا اظہار ملتا ہے جب کہ یہاں کے شعرا کی دوسری نمایاں خصوصیت تصوّف اور اظہار کی روانی ہے۔ دبستانِ دہلی کے شعرا میں جن کو نمایاں عظمت حاصل ہوئی ان میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، مظہرؔ خاں جان جاناں، عبدالحی تاباں، میر حسنؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ، ذکیؔ، رخشاںؔ، نیرؔ، مفتی صدرالدین آزردہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دبستانِ دہلی کی طرح دبستانِ لکھنؤ میں بھی غزل کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مثنوی اور مرثیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ میر حسن نے جہاں مثنوی کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا وہیں انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کو اپنی انتہا کو پہنچا دیا۔ ضمیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، تعشقؔ، مولسؔ، السؔ ایسے باکمال مرثیہ گو ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ دیگر اصناف پر قادر شعرا میں ہمیں یہاں مصحفیؔ، اِنشاؔ، آتشؔ، ناسخؔ، اور شوقؔ وغیرہ ملتے ہیں۔

جب ہم شمالی ہند میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں شاعری کے ساتھ نثر کا کام بھی ہوا۔ ''فضل علی خاں فضلی'' کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا نمونہ ہے جو مُلّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کو اس وقت تک عروج حاصل ہوا جب ۱۸۰۰ء میں شہر کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور یہاں دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

04.08 فرہنگ

اختلاط	: ملاوٹ	ریختہ	ٹوٹی پھوٹی، اردو کا پرانا نام
ایہام گوئی	: وہم میں ڈالنا، شعر میں وہ صنعت جس میں شاعری ایک لفظ کے دو معنی لائے	سازگار	موافق، مناسب
		علم بردار	: پرچم اٹھانے والا
پند	: نصیحت	گرویدہ	: اپنا بنانا

ترسیل	: روانہ کرنا، پہچانا، بھیجنا	لسانیات	: زبانوں کا علم
تشکیل	: شکل دینا، بنانا	مدارج	: مختلف مرحلے
تصنّع	: مصنوعی پن، نقل آمیز	مفید	: اچھا
تصوّف	: علم معرفت، دل سے مادی خواہشوں کو دور	ندرت	: نیا پن
	کرنے کے لئے خدا کی طرف دھیان لگانا	نشیب و فراز	: اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ
جامع	: مکمل، پورا	وارد ہونا	: آنا
دل نشینی	: دل میں جگہ بنانا، دل میں بیٹھ جانا، پسند آنا		

04.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اردو زبان کے آغاز کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : بہمنی دَور کے اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دکن میں اردو ادب کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کے آغاز کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : اردو زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لیجیے۔

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو کا ابتدائی زمانہ	از	شمس الرحمٰن فاروقی
۲۔ اردو کی کہانی	از	سید احتشام حسین
۳۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل	از	سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
۴۔ مقدمۂ تاریخِ زبان اردو	از	پروفیسر مسعود حسین خاں

04.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اردو زبان کی ابتدا تقریباً ۱۰۰۰ء کے آس پاس کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں ہوئی۔

﴿۲﴾ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں اپنے ساتھ لائے۔

﴿۳﴾ اردو کے مختلف نام رہے ہیں: دکنی، گجری، ہندی، ہندوی، اردوئے معلیٰ، زبانِ دہلوی، ہندوستانی اور ریختہ

﴿۴﴾ صوفیائے کرام نے اردو زبان کی سر پرستی اس لئے کی کہ یہ عوام کی زبان تھی اور اس کے ذریعہ عوام تک اسلامی تعلیمات باآسانی پہنچائی جاسکتی تھیں۔

﴿۵﴾ ''خالقِ باری'' حضرت امیر خسروؒ کی تصنیف ہے اور یہ بچوں کا ادب ہے۔

﴿۶﴾ میراں جی شمس العشاق (شہادت الحقیقت)، شیخ بہاء الدین باجن (خزانۂ رحمت)، میراں جی خدانما (رسالہ وجودیہ)

﴿۷﴾ اردو کے آغاز کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ ہے ''کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''

﴿۸﴾ انشاءاللہ خاں اِنشا، میر امن دہلوی، امام بخش صہبائی، مولوی عبدالحق اور سیّد سلیمان ندوی

﴿۹﴾ اردو کے تعلق سے مسعود حسین خاں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو برج، ہریانوی اور کھڑی بولی کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔

﴿۱۰﴾ دکن میں اردو ادب کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بہمنی دور، قطب شاہی دور، زوالِ گول کنڈا اور بیجا پور کے بعد کا زمانہ

﴿۱۱﴾ ''کدم راؤ پدم راؤ'' فخر الدین نظامی کی مثنوی ہے۔

﴿۱۲﴾ ولی کا دیوان 1719ء میں دلّی پہنچا۔

﴿۱۳﴾ ولی کی آمد سے پہلے اردو میں شعر کہنے والے شعرا میں سراج الدین علی خان آرزو، ٹیک چند بہار اور جعفر زٹلی ہیں۔

﴿۱۴﴾ دبستان دہلی کے تین اہم شعرا میرؔ، غالبؔ، اور مومنؔ ہیں۔

﴿۱۵﴾ دبستانِ لکھنؤ کے تین اہم شعرا آتشؔ، مصحفیؔ، اور ناسخؔ ہیں۔

اکائی 05 : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : مختلف زبانوں کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان

05.04 : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق مسعود حسین خاں کا اہم نظریہ

05.05 : خلاصہ

05.06 : فرہنگ

05.07 : نمونہ امتحانی سوالات

05.08 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اس اِکائی میں آپ اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اُردو زبان کی ابتدا کے تعلق سے پروفیسر مسعود حسین خاں کے مشہور نظریے کا جائزہ لیں گے۔ اکائی کے آخر میں پورے سبق کا ماحصل خلاصہ کی شکل میں پیش کیا جائے گا اس کے بعد مشکل الفاظ کی فرہنگ اور نمونہ جاتی امتحانی سوالات کی فہرست دی جائے گی، ساتھ ہی حوالہ جاتی کتب بھی درج کی جائیں گی تا کہ مزید معلومات کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کیا جا سکے۔

05.02 تمہید

اُردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق نظریات کا سلسلہ میر امّن سے شروع ہوتا ہے۔ اُردو کی ابتدا کے تعلق سے جن لوگوں نے نظریات پیش کیے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا خیال ہے کہ اُردو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے اور بعض کے مطابق اُردو زبان کی ابتدا کا مطالعہ جغرافیائی اور علاقائی حدود میں کرنا چاہیے۔ بہر حال آپ اس اکائی میں اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق علما کے مختلف نظریات سے روبرو ہو سکیں گے۔

05.03 مختلف زبانوں کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان

اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے تعلق سے ہندوستان میں جن لوگوں نے اپنے نظریات پیش کیے یا جن لوگوں نے اس موضوع رائے دی ہے۔ ان میں کچھ حضرات ایسے بھی ہیں کہ جن کی لسانیات کے میدان سے کوئی گہری دل چسپی نہیں رہی ہے جیسے انشاء اللہ خاں انشاؔ، میر امن دہلویؔ، امام بخش صہبائیؔ، محمد حسین آزادؔ، مولوی عبدالحق، مولوی نصیر الدین ہاشمی، سلیمان ندوی وغیرہ ہیں۔ اُردو کی ابتدا کے تعلق سے

اب تک جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اُردو زبان کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے۔ مثلاً:

﴿۱﴾ انشاءاللہ خاں انشا نے اُردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا پر مشتمل قرار دیا ہے۔

﴿۲﴾ میر امن دہلوی نے ''**باغ و بہار**'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''حقیقت اُردو زبان کی لوگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آ کر جمع ہوئے' لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔''

﴿۳﴾ امام بخش صہبائی نے رسالہ ''**قواعد اُردو**'' میں یہ لکھا ہے کہ:

''شاہجہاں آباد (دلّی) میں فارسی اور ہندی کے میل جول سے جو زبان رائج ہوئی اس کا نام اُردو قرار پایا۔''

﴿۴﴾ محمد حسین آزاد نے اپنی لازوال تصنیف ''**آب حیات**'' میں دعویٰ پیش کیا ہے کہ:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خالص ہندوستانی زبان ہے۔''

﴿۵﴾ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب '**اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا کام**' میں آٹھویں نویں اور گیارہویں صدی کی زبان کے نمونے سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بزرگانِ دین نے ہندوستانی عوام سے اپنا تعلق کرنے اور ان تک اپنی باتیں پہچانے کے لئے ان کی اور اپنی زبان کو ملانا شروع کیا۔ ان کے اس عمل سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو کہ ایک مخلوط زبان تھی جس کا نام اُردو یا ہندوستانی پڑا۔

﴿۶﴾ نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب ''**دکن میں اُردو**'' میں اُردو کا سرچشمہ پراکرت زبان کو مانتے ہیں اور وہ اس لئے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد ہوئی تو اس وقت پشاور سے لے کر الٰہ آباد تک یہی زبان بولی جاتی تھی۔

﴿۷﴾ سید سلیمان ندوی نے ''**نقوشِ سلیمانی**'' کے ایک مضمون میں اپنا نظریہ تحریر کیا ہے کہ:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں۔ اس قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

(نقوش سلیمانی...ص ۳۱)

مگر اس کے بعد جو مضامین لکھے اس میں وہ میر امن دہلوی کے ہم خیال و ہم نوا ہو گئے اسی سے متعلق ایک خطبے میں فرماتے ہیں کہ:

''اُردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔''

(نقوش سلیمانی، ص ۶)

یہاں تک ان حضرات کے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں کہ جن حضرات کا لسانیات جیسے موضوع میں کوئی خاص دل چسپی اور انہماک نہیں تھا۔اُردو زبان کی ابتدا سے متعلق کچھ نظریات کے مطالعے کو مدنظر رکھتے ہوئے اب یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے اور افادہ واستفادہ کرتے ہوئے آج اُردو زبان اس شکل میں موجود ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین بھی اس موضوع سے متعلق دستیاب مواد کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''اُردو زبان برج بھاشا سے بنی نہ پنجابی سے، بلکہ مخلوط زبانوں سے متاثر ہوکر کھڑی بولی پر اس نے بنیاد قائم کی۔''

05.04 اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق مسعود حسین خاں کا اہم نظریہ

آزادی کے بعد ماہرین لسانیات اور اُردو دنیا میں پروفیسر مسعود حسین خاں ایک منفرد وممتاز مقام رکھتے ہیں۔ڈاکٹر محی الدین زور کے بعد وہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے اُردو زبان اور اس کے آغاز کے بارے میں سائنٹفک نقطۂ نظر سے غور کیا۔ان کی کتاب ''مقدمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔یہ پروفیسر مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ ہے جو کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں (PhD) کے لئے پیش کیا گیا تھا جس پر انہیں ۱۹۴۵ء میں (PhD) کی ڈگری تفویض کی گئی بعد میں کچھ ترمیم واضافے کے ساتھ انہوں نے اسے کتابی شکل میں شائع کرایا۔اس کتاب کے ساتویں ایڈیشن میں انہوں نے مزید اضافے (جدید تحقیق کے پیش نظر) کیے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں خود لکھتے ہیں:

''اب اس ساتویں اشاعت میں نہ صرف پچھلے ۲۸ سال کی نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ وترمیمات کی گئی ہیں بلکہ اس کا تیسرا باب بھی از سرِ نو لکھ گیا ہے۔ایک لحاظ سے یہی اس مقالے کی جان ہے۔''

دراصل اس کے پہلے ایڈیشن میں اُردو کے آغاز کے سلسلے میں صرف کھڑی بولی کو اہمیت دی گئی تھی لیکن بعد میں جدید تحقیق کی روشنی میں کھڑی کے ساتھ ساتھ ہریانی کو بھی غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''قدیم دکنی زبان کے مطالعے کے سلسلے میں اب تک ہریانی کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔حالاں کہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔''

اُردوئے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلے میں جو اہمیت ہریانی کو حاصل ہے۔اس کی طرف سب سے پہلے اشارہ پروفیسر ژول بلاک نے اپنے مضمون ''ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل'' کیا ہے۔

پروفیسر ژول بلاک لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا اور عرصہ تک رہا۔اسی لئے پنجابی اور اُردو کی مماثلت یاد۔لیکن یہ اس قیاس کے مانع نہیں کہ ہندی لشکروں کے جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے پنجاب سے متعلق تھے، بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے

تھے۔مغربی روہیل کھنڈ کے متعلق مَیں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ ان اضلاع کی اُردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔''

(بیلٹن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز جلد ۵۔ص ۳۰ ۷)

اس نظریے کی ترغیب پروفیسر مسعود حسین خاں کو پروفیسر ژول بلاک کے مذکورہ تحقیقی مضمون سے ملی ہے۔جس میں انہوں نے اُردو کے آغاز کے سلسلے میں ہریانی کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اسے ہی بعد میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا۔بس فرق یہ ہے کہ ژوال بلاک صرف ہریانی کی بات کرتے ہیں جب کہ مسعود حسین خاں نے ہریانی کے ساتھ ساتھ نواح دہلی کی دیگر بولیوں کو بھی اہمیت دی ہے۔قدیم اُردو (دکنی) کا پنجابی پن، ہریانی پن بھی ہے لیکن دکن کی یہ صوتیاتی اور تشکیلیاتی خصوصیات صرف ہریانی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جمنا پار کھڑی بولی کے علاقے میں بھی یہی خصوصیات مل جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے اُردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن چوں کہ دہلی مدّتوں صدر مقام رہا اس لئے اُردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے۔

''مقدمۂ تاریخِ زبان اُردو'' کے آٹھویں ایڈیشن میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے نظریے پر نظر ثانی کر کے اسے قطعیت دے دی ہے ان کے نظریے کا خلاصہ ونتیجہ یہ ہے کہ اُردو برج، ہریانی اور کھڑی بولی سے مل کر بنی ہے۔کتاب کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں:

''زبانِ دہلی وپیرامنش'' اُردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے۔اور ''حضرتِ دہلی'' اس کا حقیقی مولد ومنشا''

''زبان دہلی وپیرامنش'' کی اصطلاحی روشنی مسعود صاحب کو حضرت امیر خسرو سے ملی ہے۔امیر خسرو نے اپنی مثنوی کی کتاب ''نُہ سپہر'' میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کے نام گنوائے ہیں۔ان میں سے ایک ''لاہوری'' اور دوسری ''زبان دہلی وپیرامنش'' ہے۔زبان دہلوی اور پیرامنش سے مراد زبان دہلوی اور اس کے نواح کی کھڑی اور ہریانی کے ہیں۔اسی پر مسعود صاحب کا نظریہ قائم ہے۔مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ اُردو کا ڈھانچہ کھڑی بولی پر تیار ہوا ہے۔جمنا پار کی ہریانوی اور کھڑی بولی، قدیم اُردو ودکنی سے قریب تر ہے۔جدید اُردو اپنے صرف ونحو کے اعتبار سے مراد آباد اور رام پور کے اضلاع کی بولی سے قریب ہے۔بعد میں برج بھاشا، اُردو کا لب ولہجہ متعین کرنے میں اثر انداز ہوئی۔

﴿ **کھڑی بولی** ﴾ اس کے دو روپ ہیں۔ایک وہ روپ ہے جو دوآبۂ گنگ وجمن کے بالائی حصّے یعنی سہارنپور، مظفرنگر اور میرٹھ میں رائج ہے۔دوسرا روپ گنگا پار کے بجنور، رام پور اور مراد آباد کے اضلاع میں بولا جاتا ہے۔ان اضلاع میں بولی جانے والی کھڑی بولی کو مسعود صاحب اُردو سے قریب ترین خیال کرتے ہیں۔کھڑی اور دکن کی صوتی وصرفی کئی مماثلتیں پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کی ہیں۔ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ دکنی اُردو کی طرح کی کھڑی بولی کی عام خصوصیت ہے کہ اس میں درمیانی (ہ) گرادی جاتی ہے۔جیسے کاں (کہاں) کبی (کبھی)۔

﴿۲﴾ کھڑی بولی میں اکثر (ڑ) اور (ڑھ) پر ڈ اور ڈھ کو ترجیح دی جاتی ہے۔جو دکنی کی بھی خصوصیت ہے اور پنجابی کی بھی۔جیسے بوڑھا (بڈھا) گڑھا (گڈا)۔

﴿۳﴾ دکنی اُردو میں جمع کی علامت (اں) ہے کہیں کہیں (وں) سے بھی بنائی جاتی ہے۔(اں) کی جمع آج میرٹھ، مظفرنگر اور سہارنپور کے اضلاع میں سنائی دیتی ہے۔جیسے دناں، کھیتاں، عورتاں وغیرہ۔

﴿۴﴾ (نے) کا استعمال دکنی اُردو کی طرح کھڑی بولی میں بھی باقاعدہ طور پر پایا جاتا ہے یعنی یہ فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے ویسے دکنی میں ''نے'' کا استعمال کم ہوتا ہے۔

﴿۵﴾ ضمائر میں دکنی اُردو کا (یو) آج بھی کھڑی کے علاقے میں مستعمل ہے۔

﴿۶﴾ دکنی اُردو کا (اُو) یعنی وہ کھڑی میں (اُوہ) کی شکل میں رائج ہے۔

﴿۷﴾ دکنی میں عام طور پر اضافی حالت میں ''میرا، تیرا'' کی بجائے ''مُج، مُنج اور تج'' استعمال ہوتا ہے۔قدماء کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً حاتم کے یہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔موجودہ اُردو اور دہلی کی بولیوں میں اب یہ متروک ہے۔

﴿۸﴾ دکنی کے ضمائر میں سب سے قابل ذکر ''اپس'' ہے جو کہ قلی قطب شاہ سے لے کر ولی تک یکساں طور پر خود کے معنوں میں مستعمل ہے۔اس کا تعلق بھی نواحِ دہلی کی بولی سے ہے۔

﴿۹﴾ دکنی اُردو کے اکثر افعال کی توجیہ ہریانوی اور کھڑی کے افعال سے کی جاسکتی ہے۔دکنی اور ادبی اُردو افعال کی بیش تر شکلوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔مثلاً جائے ہے، کھائے ہے، ماروں ہو، آوے، لاوے، کیجیو، دیجیو، ہووے گا نواح دہلی اور دہلی میں بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔قدیم اُردو میں تو ان کا استعمال عام ہے۔

﴿۱۰﴾ دہلی، نواح دہلی اور دکنی میں انفی آواز آج بھی سنائی دیتی ہے۔جیسے آنا سے آناں، کھانا سے کھاناں، چاول سے چانول وغیرہ۔

﴿۱۱﴾ دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواحِ دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں۔ان میں سے کوں، سوں، سی، منے، لگ، دکنی میں عام طور پر مستعمل تھے۔'لگ' تو دہلی کے قدیم شعرا کے یہاں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔

﴿قدیم دکنی کے اکثر غیر مانوس یا غریب الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی بولیوں سے کی جاسکتی ہے﴾

جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ **دِھر یا دِھیر:** بمعنی سمت اور طرف کے استعمال ہوا ہے۔نواحِ میرٹھ کی بولی میں 'دھورے' اب تک سمت کے معنی میں مستعمل ہے۔

﴿۲﴾ **کدھیں:** (کبھی) کے معنوں میں اب تک دہلی اور اس کے اطراف میں مستعمل ہے۔

﴿۳﴾ **اتاولا:** (جلد باز) قدیم دکنی میں جلدی کے معنی میں مستعمل ہے۔دہلی کا محاورہ ہے ''اتاؤلا باؤلا'' یعنی جلد باز پاگل ہوتا ہے۔

﴿۴﴾ **اپی:** آپ ہی کے معنوں میں پانی پت اور کرنال میں سنائی دیتا ہے۔

﴿۵﴾ **اِتا۔جِتّا:** جہلا میں عام مستعمل ہے۔

﴿۶﴾ **فکروند:** فکرمند ہریانی میں عام طور سے ''م'' (و) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔جیسے دہلی میں چلمن کو چلون عام طور سے کہتے ہیں۔

﴿۷﴾ **وستاد، وصول:** بمعنی استاد، اصول قدیم دکنی میں آج بھی ملتے ہیں۔دہلی اور میرٹھ کی بولی میں یہ عام ہیں جہاں استاد کو 'وستاذ' اور ان کو 'ون' بولا جاتا ہے۔

﴿۸﴾ **اُپجنا:** (اُگنا، پیدا ہونا) خالص سنسکرت کا لفظ ہے جو دکنی میں ملتا ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے۔ ''بو یا گیہوں اُپجا جَو'' (بھلائی کے بدلے برائی)

﴿۹﴾ **پتیانا:** (یقین کرنا، بھروسہ کرنا) قدیم دکنی ادب میں ملتا ہے۔ دہلی میں محاورے عام ہیں۔ ایک محاورہ ہے۔ ''اندھا جب پتیائے جب دو آنکھیں پائے'' (یعنی جب اندھا یقین کر لے تب اپنی آنکھیں پالے)

﴿۱۰﴾ **سیونا:** (پرورش کرنا، خدمت کرنا) دکنی میں مستعمل ہے۔ دہلی کا محاورہ ہے ''انڈے سیوے فاختہ کوّے میوے کھائیں''

﴿۱۱﴾ **ناؤں اور ٹھاؤں:** (نام اور جگہ) قدیم دکنی میں مستعمل ہے۔ دہلی کے دو محاوروں میں یہ جوں کے توں ملتے ہیں۔

۱۔ پھٹے میں پاؤں، دفتر میں ناؤں۔ ۲۔ ثابت قدم کو ہر جگہ ٹھاؤں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں ان مماثلتوں کے بارے میں اپنا اظہار خیال پیش کرتے ہیں کہ مراہٹی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی اُردو کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی تین بولیوں (ہریانی، کھڑی، اور برج) سے کی جاسکتی ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں لسانی ارتقا رک سا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اُردو میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے چھ سو برس پہلے رائج تھیں۔ اسی سے طے پاتا ہے کہ ہریانی نے قدیم اُردو کی تشکیل میں حصّہ لیا۔ کھڑی بولی نے جدید اُردو کا رول تیار کیا۔ برج بھاشا نے اُردو کا معیاری لب ولہجہ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین صاحب سے قبل کسی نے ان زبانوں کا لسانیاتی تجزیہ نہیں کیا تھا۔ موصوف نے اُردو زبان کے آغاز وارتقا میں ان زبانوں کے تعاون کا لسانیاتی اور سائنٹفک انداز میں تجزیہ کر کے مدلل طور پر اپنا نظریہ پیش کیا کہ ''زبانِ دہلی و پیرامنش اُردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور حضرتِ دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا، جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے''

05.05 خلاصہ

اُردو زبان کے ابتدا کے متعلق مختلف نظریات سامنے آتے ہیں۔ ان نظریات کا سلسلہ میرامن کی ''باغ و بہار'' سے شروع ہوتا ہے ابتداً جن حضرات نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کا تعلق علم لسانیات سے نہیں تھا اس میں شک نہیں کہ وہ اُردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور اہل قلم تھے۔ ان میں سے بعض کی رائے تھی کہ اُردو مختلف زبانوں کے میل جول سے بنی ہے اور بعض اصحاب نے اُردو زبان کو مختلف جغرافیائی اور علاقائی حدود کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ میرامن، امام بخش صہبائی نے اپنا نظریہ اُردو کے ''ملواں'' یعنی کھچڑی زبان ہونے کا پیش کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف ''نقوشِ سلیمانی'' میں اُردو کا مولد وادیِ سندھ سے جوڑا۔ محمد حسین آزاد کا اپنی تصنیف ''آبِ حیات'' میں دعوی کہ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے'' اس کے علاوہ ہیورنلے، شمس اللہ قادری نے بھی یہی بات کہی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی اپنی تصنیف ''دکن میں اُردو'' میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ''دکن میں اُردو کی ابتدا ہوئی'' پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اُردو'' یہ نظریہ پیش کیا کہ ''اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی'' ڈاکٹر محی الدین زور نے اُردو پر کھڑی اور ہریانی کے اثرات کا ذکر کیا، ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ کہ کھڑی یا ہندوستانی (اُردو) بالائی دوآبے میں بولی جانے والی زبانوں کی فطری اور ترقی یافتہ شکل و صورت ہے۔ پروفیسر ژول بلاک نے بھی اُردو پر ہریانی کے اثرات کی نشان دہی کی۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے صرف ہریانی کی اہمیت پر

زور دیا اور نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں کو نظر انداز کر دیا مگر پروفیسر مسعود حسین خاں نے اُردو کے دہلی اور نواحِ دہلی میں پیدا ہونے کا نظریہ پیش کیا اور اس کو مدلل اور تجزیاتی انداز میں ثابت کیا ہے کہ ''زبان دہلی اور پیرامنش اُردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور ''حضرتِ دہلی'' اس کا حقیقی مولد و منشا''۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ ہی مدلل و مثبت ہے۔

05.06 فرہنگ

اختلاط	:	میل جول	دخیل	:	داخل ہونا
اخذ کرنا	:	لے لینا	دلائل	:	دلیل کی جمع، ثبوت
ارتباط	:	ملاوٹ	شواہد	:	شہادت کی جمع، ثبوت
ارتقا	:	بڑھنا	عوامل	:	عامل کی جمع
اشتراک	:	شرکت کرنا	غریب الفاظ	:	نامانوس الفاظ
انہماک	:	غور وفکر	مبنی	:	بنیاد
تجزیہ کرنا	:	جائزہ پیش کرنا	محققین	:	محقق کی جمع، تحقیق کرنے والے
تردید	:	رد کرنا، نامنظور کرنا	مستحکم	:	مضبوط
تناظر	:	نظریے میں	مشتق	:	نکلا ہوا
تنسیخ	:	منسوخ کرنا	معرض وجود	:	وجود میں آنا، پیدا ہونا
جہلا	:	علم سے ناواقف لوگ	نشوونما	:	پرورش پانا
حقائق	:	حقیقت کی جمع، اصلیت	نظریات	:	نظریہ کی جمع، موقف
خمیر	:	سرشت	ہیولیٰ	:	ڈھانچہ، خاکہ

05.07 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق پانچ نظریات لکھیے۔

سوال نمبر۲ : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق محمد حسین آزاد کا نظریہ لکھیے۔

سوال نمبر۳ : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق سید سلیمان ندوی کا نظریہ لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق مسعود حسین خاں کا نظریہ لکھیے۔

سوال نمبر۲ : اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

سوال نمبر۳ : اُردو کی پیدائش دکن میں ہوئی؟ یہ کس کا نظریہ ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : میر امن دہلوی کی ذیل کی کتابوں میں کون سی کتاب ہے؟

(الف) داستان زبان اُردو (ب) نقوش سلیمانی (ج) ہندوستانی لسانیات (د) باغ و بہار

سوال نمبر۲ : ''آب حیات'' کے مصنف کون ہیں؟

(الف) شوکت سبزواری (ب) زور (ج) آزاد (د) شمس اللہ قادری

سوال نمبر۳ : ''اُردو زبان کا ارتقا'' کس سنہ میں شائع ہوئی؟

(الف) ۱۹۵۵ء (ب) ۱۹۵۶ء (ج) ۱۹۵۷ء (د) ۱۹۵۸ء

سوال نمبر۴ : ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' کا پہلا ایڈیشن کس سنہ میں آیا؟

(الف) ۱۹۴۸ء (ب) ۱۹۵۰ء (ج) ۱۹۵۲ء (د) کوئی نہیں

سوال نمبر۵ : امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کی کتنی بولیوں کے نام گنوائے ہیں؟

(الف) ۱۰ (ب) ۱۱ (ج) ۱۲ (د) ۱۳

سوال نمبر۶ : ''ہندوستانی فونی ٹیکس'' انگریزی زبان میں کہاں سے شائع ہوئی؟

(الف) دہلی (ب) جرمن (ج) لندن (د) پیرس

سوال نمبر۷ : ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کون سی کتاب نہیں ہے؟

(الف) اُردو زبان کا ارتقا (ب) قواعد اُردو (ج) اُردو لسانیات (د) داستان زبان اُردو

سوال نمبر۸ : ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' کے کس ایڈیشن میں مسعود صاحب نے نظر ثانی کی ہے؟

(الف) دوسرا ایڈیشن (ب) چوتھا ایڈیشن (ج) چھٹا ایڈیشن (د) آٹھواں ایڈیشن

سوال نمبر۹ : ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) امام بخش صہبائی (ب) نصیر الدین ہاشمی (ج) مولوی عبدالحق (د) انشاء اللہ خاں انشؔا

سوال نمبر۱۰ : ''زبان دہلی و پیرامنش' اُردو کا اصل منبع و سرچشمہ ہے اور 'حضرت دہلی' اس کا حقیقی مولد و منشاء'' کس کتاب کا اختتام ہے؟

(الف) نقوش سلیمانی (ب) مقدمۂ تاریخ زبان اُردو (ج) اعجاز سخن (د) آب حیات

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) باغ و بہار جواب نمبر۲ : (ج) آزاد

جواب نمبر۳ : (ب) ۱۹۵۶ء جواب نمبر۴ : (الف) ۱۹۴۸ء

جواب نمبر۵ : (ج) ۱۲ جواب نمبر۶ : (د) پیرس

جواب نمبر۷ : (ب) قواعد اُردو جواب نمبر۸ : (د) آٹھواں ایڈیشن

جواب نمبر۹ : (ج) مولوی عبدالحق جواب نمبر۱۰ : (ب) مقدمہ تاریخ زبان اُردو

05.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آبِ حیات	از	محمد حسین آزاد
۲۔ اُردو زبان کا ارتقا	از	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۳۔ اُردو زبان کی تاریخ	از	مرزا خلیل احمد بیگ
۴۔ پنجاب میں اُردو	از	حافظ محمود شیرانی
۵۔ مقدمہ تاریخ زبان اُردو	از	حافظ محمود شیرانی

بلاک نمبر 02

اکائی 06	بہمنی عہد میں اُردو ادب	محمد سالم
اکائی 07	قطب شاہی عہد میں اردو ادب	محمد افضل حُسین
اکائی 08	عادل شاہی عہد میں اردو ادب	محمد افضل حُسین
اکائی 09	ولؔی اور سراؔج کا دَور	غلام جیلانی

اکائی 06 : بہمنی عہد میں اُردو ادب

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : بہمنی سلطنت: تعارف

06.04 : علاءالدین حسن بہمن شاہ (۱۳۴۷_۱۳۵۸)

06.05 : محمد شاہ ثانی (۱۳۷۸_۱۳۷۹)

06.06 : فیروز شاہ

06.07 : میراجی شمس العشاق

06.08 : حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

06.09 : چکی نامہ

06.10 : سید محمد اکبر حسینی

06.11 : نظامی بیدری

06.12 : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

06.13 : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ

06.14 : صدرالدین

06.15 : مشتاق

06.16 : لطفی

06.17 : خلاصہ

06.18 : فرہنگ

06.19 : نمونہ امتحانی سوالات

06.20 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی مطالعہ کرنے بعد آپ درج ذیل معلومات حاصل کرسکیں گے۔

۱۔ بہمنی حکومت قیام اور پس منظر

۲۔ بہمنی حکومت کے حکما کے متعلق مختصر معلومات

۳۔ میران جی شمس العشاق کا مختصر تعارف

۴۔ میران جی شمس العشاق کتابوں کا مختصر تعارف

۵۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے حالات اور ادبی خدمات

۶۔ سید محمد اکبر حسینی کی خدمات

۷۔ نظامی بیدری کی مشہور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ

06.02 تمہید

مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی شکل وجود میں آئی تو اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ ہند یا یعنی ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو الہندی'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو "زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کی گئی۔

علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ جب گجرات پہنچی تو گجری کہلائی۔ خلجی اور تغلقی فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ ولی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوبارہ دلی پہنچتی ہے تو ریختہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہی لشکر میں جب وہ رہنے لگی تو اردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بھنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔ اردو زبان کا آغاز شمالی ہندوستان (North India) سے ہوا۔ شمالی ہندوستان میں پنجاب کے مختلف علاقے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس وقت پنجاب میں محمود غزنوی اور محمد غوری کی حکومتیں قائم تھیں۔ اس نے پنجاب پر حکومتی استحکام کرنے کے بعد اپنے معتمد غلام ایاز کو یہاں کا انتظام و انصرام سپرد کیا۔ سلطان نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔ اس کا سپہ سالار سونبدر رائے تھا جو ہندوستانی زبانوں کا بہت دلدادہ تھا۔ بیرونی حکومت کے قیام سے تہذیبی، سماجی، لسانی اشتراک و اختلاط کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ باہر سے آنے والے فاتحین کی زبان ترکی و فارسی تھی اور مقامی لوگوں کی پنجابی، ہندی، برج بھاشا اور کھڑی بولی تھی۔ حکومت کے عہدداران اور عوام کے درمیان بطور رابطہ ایک مشترکہ و مخلوط زبان جنم لیتی ہے۔ جس کو ہندی یا ہندوی کے نام سے موسوم کیا گیا۔

محمود علم وعلما کی بہت قدردانی کرتا تھا۔ اس کے دربار میں ادبا و شعرا کی خاصی تعداد موجود تھی۔ جن میں فردوسی، اَسدطوسی قابل ذکر ہیں۔ غزنوی خاندان کے دیگر سلاطین و حکم رواں بھی علم وعلما کی قدر کیا کرتے تھے۔ ان حکم رواں کو علما و فضلا کی سرپرستی کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔

06.03 بہمنی سلطنت

بہمنی سلطنت محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں ہونے والے اِنتشار کا نتیجہ تھی۔ اُمرائے گجرات کے ساتھ ساتھ گلبرگہ، دولت آباد کے رؤسا نے سلطان کے خلاف آواز بلند کر دی تھی۔ محمد بن تغلق کے دور حکومت میں ہر ایک موضع میں ایک ایک افسر کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان افسران کو اَمیران صَدّہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اَمیرانِ صَدّہ کی اکثریت دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آ کر مقیم ہوئی تھی۔ اَمیران صَدّہ اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے دکن اور گجرات کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ حکومت نے مال گزاری کی ذمے داری اَمیران صَدّہ کے سپرد کر رکھی تھی۔ انہوں نے دکن اور گجرات میں سکونت اختیار کرنے کے بعد مقامی زبان کو ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ بنایا تھا۔ اسی زبان کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بعدازاں یہی مقامی زبان رابطہ کی زبان بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اس نظام کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے۔ تجارت، لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط تر ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کا حلقہ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا اور ان علاقوں میں یہ زبان عالمی زبان کی حیثیت میں پھلتی پھولتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی اور صوفیوں، شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں اس کے ادبی روپ کو گجری نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی۔''
>
> (تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:۱۳)

بہمنی سلطنت شمال میں وِندھیا سے جنوب میں تنگا بھدرا (Tungabhadra) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اہم علاقے دولت آباد، برار، بیدر، گولکنڈہ، احمد نگر، گلبرگہ وغیرہ تھے۔ ابتدا میں اس سلطنت کا دارالحکومت (راجدھانی) کلبرگی/گلبرگہ (حسن آباد) تھی، جسے بعد میں محمد آباد (بیدر) منتقل کر دیا گیا۔ اس سلطنت کے کل اٹھارہ سلطانوں نے تقریباً ۲۰۰ برسوں تک حکمرانی کی۔ اس سلطنت کے سلاطین وارنگل (Warangal) اور وجے نگر (Vijayanagara) سلطنت کے حکمرانوں کے ساتھ مسلسل تنازع کی صورت قائم رہی۔

وجے نگر سلطنت کا عروج و زوال:

بہمنی سلطنت اپنی توسیع کے عروج پر پہنچی جب وزیر محمود گاوان نے گوا (Goa) پر قبضہ کر لیا جو وجے نگر سلطنت کے تحت تھا۔ دکنی اور افغانی امرا کے درمیان باہمی کشمکش کی وجہ سے ۱۴۸۱ء میں محمد شاہ سوم نے محمود گاوان کو موت کی سزا سنائی۔ درحقیقت بہمنی سلطنت میں امرا دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے- آفاقی اور دکنی۔ آفاقی امیر غیر ملکی نسل کے شیعہ تھے، جبکہ دکنی مقامی نسل کے سنی مسلمان تھے جو بہت پہلے جنوبی ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے۔ بہمنی دور حکومت کے بادشاہوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

﴿۱﴾ علاالدین حسن بہمن شاہ (۱۳۴۷ء۔۱۳۵۸ء)

﴿۲﴾ محمد شاہ اول (۱۳۵۸ء۔۱۳۷۵ء)

﴿۳﴾ محمد شاہ ثانی (۱۳۷۸ء۔۱۳۷۹ء)

﴿۴﴾ تاج الدین فیروز شاہ (۱۳۹۷ء۔۱۴۲۲ء)

﴿۵﴾ شہاب الدین احمد شاہ اول (۱۴۲۲ء۔۱۴۳۶ء)

﴿۶﴾ علاالدین احمد شاہ ثانی (۱۴۳۶ء۔۱۴۵۸ء)

﴿۷﴾ ہمایوں شاہ (۱۴۵۸ء۔۱۴۶۱ء)

﴿۸﴾ نظام شاہ (۱۴۶۱ء۔۱۴۶۳ء)

﴿۹﴾ شمس الدین محمد شاہ ثالث (۱۴۶۳ء۔۱۴۸۲ء)

06.04 علاءالدین حسن بہمن شاہ (۱۳۴۷۔۱۳۵۸)

علاءُالدین بہمن شاہ دکن کے خاندان بہمنیہ کا سب سے پہلا سلطان تھا۔اس نے ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ کو دارالحکومت قائم کیا تھا۔اس نے گلبرگہ کا نام تبدیل کر کے حسن آباد کر دیا۔علاءُالدین بہمن شاہ خود کو ایران کے اَسفندیار کا خاندانی بتاتا تھا لیکن تاریخِ فرشتہ کے مصنف نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے ایک برہمن نجومی گنگا دھر شاستری کا ایک ملازم قرار دیا ہے۔علاءُالدین بہمن شاہ نے اپنی حکومت کو اچھی طرح سے چلانے کے لیے اپنے دائرہ حکومت کو چار حصوں، گلبرگہ، دولت آباد، برار اور بیدر میں تقسیم کر دیا تھا۔

بہمن شاہ ایک انصاف پسند بادشاہ تھا۔مؤرخین نے اس کی انصاف پسندی کی تعریف کی ہے۔۱۳۵۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول تخت نشین ہوا۔

06.05 محمد شاہ ثانی (۱۳۷۸ء۔۱۳۷۹ء)

محمد شاہ اول کا بیٹا اور سلطان علاءُالدین بہمن شاہ کا پوتا تھا۔اس کی تخت نشینی کے بعد صوبے میں پیدا ہونے والے اِنتشار اور مخالفت نے دم توڑ دیا۔محمد شاہ خوش اخلاقی و خوش مزاجی جیسی اعلیٰ صفات سے بہرہ ور تھا۔محمد شاہ ایک تعلیم یافتہ بادشاہ تھا۔اس نے اپنی زندگی کا خاصہ وقت علم کی حصولیابی میں صرف کیا تھا۔دوران طالب علمی اس نے انتہاتی جاں فشانی سے علم حاصل کیا اور اعلیٰ درجے کی علمی اِستعداد پیدا کی۔ محمد شاہ کو تمام علوم وفنون میں اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔اسے عربی و فارسی پر عبور حاصل تھا۔اس کو خوش اسلوبی سے عربی و فارسی میں خطاطی کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔اس کے دور حکومت میں صوبے میں امن و آشتی کا بول بالا رہا اس کے دور اقتدار میں کسی بھی جنگی واقعات کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا اسی وجہ سے اس کے زمانے کے لوگ اس کو ارسطوے زمانہ کہہ کر طنز کیا کرتے تھے۔

اس کی بابت متعلق عبدالمجید صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''اس عہد کی ترقیوں میں ایک تو قانون کی پابندی اور عدل وانصاف کا بول بالا ہے، اور دوسرے علم وفن کی ترویج ہے، محمد شاہ نے زندگی بھر قانونِ شرع کی پوری پابندی کی، اور جہاں انصاف کا معاملہ تھا بڑے بڑے آدمیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑا تو قحط زدوں کی امداد کے لیے بہت کچھ کیا گیا۔یہ کہا جاتا ہے کہ گجرات اور مالوے سے غلہ لانے کے لیے دس ہزار بیل لگائے گیے تھے۔دوسری طرف علم وفن کی ترویج میں بھی محمد شاہ نے بہت حصہ لیا، کیوں کہ محمد شاہ بہمنی خاندان کا بڑا علم دوست بادشاہ تھا بچپن سے اس کو

علم وفن کا چسکا تھا عجیب اتفاق کی بات ہے کہ محمد شاہ کو فضل اللہ انجو جیسے جید عالم مل گئے۔ میر فضل اللہ دنیائے اسلام کے مشہور علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد تھے اور اسی عہد میں شیراز سے دکن آئے، ان کے علم وفضل کی بادشاہ نے بہت قدر کی اور ان کو بہت جلد صدر جہاں بنا دیا، جو ندربی وزارت تھی فضل اللہ کی رہبری میں اور کئی علما دکن میں جمع ہوئے اور ان کو ہزاروں روپے دیے گیے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک ایرانی شاعر کو ایک قصیدے کے صلے میں جو دربار میں پڑھا گیا تھا، ایک ہزار اشرفیاں دی گئی تھیں۔ خود خواجہ حافظ بھی، جو شیراز کے بلند پایہ شاعر تھے محمد شاہ کی علم دوستی اور فیاضی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، اور دکن آنے کا ارادہ کیا۔ جب ان کی خواہش در بابہ دکن کو معلوم ہوئی تو انھیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی اور سفر کے لیے روپے بھی بھیجے گیے تھے لیکن خواجہ صاحب ہمراہیوں کے ناروا سلوک اور سمندر کے سفر سے ڈر گئے، اور دکن کا ارادہ ترک کر دیا۔''

(تاریخ دکن بہمنی سلطنت، عبد المجید صدیقی باب پنجم ص ٦٢)

محمد شاہ کو عہد طفولیت سے ہی علم حاصل کرنے کا جذبہ وذوق تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فضل اللہ جیسے جلیل القدر عالم وفاضل سے اِکتساب فیض کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مولانا فضل اللہ انجو کو اس نے صدورِ جہاں کے عہدے پر مقرر کیا۔ فضل اللہ انجو عالم گیر شہرت یافتہ عالم دین علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد رشید تھے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی اپنے وقت کی عظیم المرتبت شخصیت کا نام ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے دوران تفتازان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مختلف علوم وفنون میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔

محمد شاہ کی علم دوستی وعلم پروری سے متاثر ہوکر فارسی شاعری کے آفتاب و ماہتاب شاعر حافظ شیرازی نے دکن آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ علامہ شیرازی کی اس خواہش کا جب محمد شاہ کو علم ہوا تو اس نے سفر کے تمام اخراجات کا بندوبست اپنے ذمے لیا لیکن علامہ شیرازی نے سفر کی دشواریوں کے باعث اس ارادے کو ترک کر دیا تھا۔

06.06 فیروز شاہ

بہمنی خاندان کا آٹھواں سلطان تاج الدین فیروز شاہ سلطان داؤد شاہ کا بیٹا تھا۔ سلطان فیروز شاہ کا زمانہ کئی معانی میں اہمیت کا حامل ہے۔ فیروز شاہ نے اپنی ہم سائی ریاست وجے نگر کے خلاف تین جنگیں کی تھیں۔ تاج الدّین فیروز شاہ غیر معمولی طور پر ذہانت وفراست کا مالک تھا۔ فیروز شاہ نے اپنے استاد فضل اللہ سے اکتساب فیض کیا تھا۔ بہمنی سلطنت میں فیروز شاہ کے دور کو خاندان بہمنی کا عہدِ زریں (Golden Era) تسلیم کیا جاتا ہے۔ فیروز شاہ نے اپنے عہد میں تہذیب وتمدن اور علم وفضل کی قدردانی کی اور اس کے فروغ کے لیے نمایاں کام انجام دیے۔ بعض مؤرخین فیروز شاہ کو دکن کا تاج تسلیم کرتے ہیں۔

فیروز شاہ کو تعمیراتی کاموں سے غیر معمولی شغف تھا۔ اس نے اپنے دارالحکومت گلبرگہ میں کئی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کروائی تھیں۔ فیروز شاہ نے ایک مشہور زمانہ مسجد، جو مسجد قرطبہ کی طرز پر ایک مسجد کی تعمیر کروائی۔ اس طرح فیروز شاہ کا زمانہ علم وادب کے ساتھ ساتھ دیگر فلاحی وترقیاتی کاموں کے لحاظ سے بھی قابل ذکر رہا ہے۔

06.07 میراجی شمس العشاق

میراں جی شمس العشاق: میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔آپ کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی اس کے بعد ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لے آئے۔میراں جی کو سب سے پہلے مستقل شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔آپ خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے،شاہ کمال الدین کو شاہ جمال الدین مغربی سے شرف بعیت حاصل تھا۔یوسف عادل شاہ آپ کے حلقہ معتقدین میں شامل تھا۔۲۵ شوال المکرّم ۹۰۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔آپکی سن وصال ''شمس العشاق'' کے اعداد سے نکالی جاتی ہے۔جس کے اعداد ۹۰۶ھ نکل کر آتے ہیں۔میراں جی کی تمام تصانیف کا موضوع تصوف ورشد وہداہت ہے۔میراں جی شمس العشاق کی چار اہم کتابیں دستیاب ہیں۔

﴿۱﴾ خوش نامہ ﴿۲﴾ خوش نغز

﴿۳﴾ شہادت التحقیق ﴿۴﴾ مغزمرغوب

درج بالا چاروں نظموں پر مشتمل ہیں۔جن کے متعلق مختصر معلومات درج ذیل پیش کی جارہی ہے۔

خوش نامہ:

یہ ایک سوستر اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم ہے۔اس میں ایک خوب صورت ونیک سیرت لڑکی ''خوش'' کو مرکزی کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔خوش کو اللہ رب العزت نے نیک سیرت کے ساتھ ساتھ پیکر حسن بھی بنایا ہے۔جس کی وجہ سے سبھی اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔اس کی خوش اخلاقی نے سب کے دلوں کو رام کرلیا تھا۔لیکن رضائے الٰہی سے محض سترہ برس کی عمر میں اللہ تعالی کو پیاری ہوگئی۔ اس کی موت سے میراں جی اخلاقی نتائج اخذ کر کے روحانی مسائل کی تشریحات پیش کرتے ہیں۔

چند اشعار بطور نمونے درج ذیل ہیں۔

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
خوش خوشیاں اللہ کیرا نوراًاعلی نور
کھنڈیا خوش کوش نامہ تحت ہوا تما م
خوش سب کوئی دایم جیتا خودھن عوا م

خوش نغز:

۱۷۲ اشعار پر مشتمل ایک خوبصورت نظم ہے۔اس میں بڑا ہی دل چسپ انداز استعمال کیا گیا ہے۔خوش سوالات کی شکل میں تصوف کے مسائل جیسے عقل،عشق،مراقبہ اور عرفان پوچھتی ہے اور میراں جی شمس العشاق انتہائی دل کش پیرائے میں جوابات پیش کرتے ہیں۔

جسے ہماری ارادت کی ان کا یہ احکام
نماز تسبیح نیتاں ذکر اللہ یک نام
اس پر جیتا رہے صدق سن اوتا اچھے لاب
دین دنیا دیدار بہشتاں پاویں بے حساب

شہادت التحقیق:

یہ نظم ۱۵۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں بھی دینی مسائل کے ساتھ ساتھ شریعت وطریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں بھی سوال وجواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔میرید سوال کرتا ہے اور مرشد اس کا جواب دیتے ہیں۔اس میں قرآن حدیث کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔یہ نظم انکی دیگر نظموں کے مقابلے میں زیادہ سلیس ہے۔حمد کے اشعار درج ذیل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن	الرحیم تو سبحان
یہ سب عالم تیرا	رزاق سبھوں کیرا
تجھ بنا ورنکوئے	تا خالق دوجا ہوئے
جے تیرا ہوئے کرم	تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں	اور تیرا نام لیوں
تجھ نرتا کون جانے	اور پوری صفت بکھانے
ہے تیرا انت نہ پار	کس مکھوں کروں اچار
جو تیرا امر جانے	اس نہی کو نہ مانے

حمد یہ اشعار کے بعد چند اشعار منقبت کے ہیں اور اس کے بعد اپنے پیر ومرشد کا ذکر کیا ہے۔میران جی نے اس میں تصوف کے مسائل بیان کیے ہیں۔

06.08 حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

قطب الاقطاب، شیخ المشائخ، سید محمد حسینی عرف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تہہ دار شخصیت بہت سارے فضائل وکمالات اور خصوصیات کی جامع تھی۔علم وحکمت، فضل وکمال، سلوک وعرفان، طریقت ومعرفت، ولایت وروحانیت اور زہد وتقویٰ کی ساری خوبیاں ایک مرکز پر سمٹ آئی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اپنے اپنے وقت کے اکابر علما ومصنفین اور عظیم المرتبت مشائخِ طریقت نے آپ کے علم وولایت اور زہد وتقوی کے عالی مقام کا کشادہ قلبی سے اعتراف کیا ہے۔خواجہ بندہ نواز کی ولادت بسعادت ۷۱۲ھ ہجری میں شہر دلی میں ہوئی۔۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں جب کہ امیر تیمور لنگ نے دہلی پر حملہ کیا، آپ دہلی سے گوالیار، چندیری، بڑودہ سے راستے گجرات گئے اور پھر دولت آباد کے راستے گلبرگہ شریف پہنچے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''حضرت کے بہت بڑے خلیفہ اور جان نشین شیخ نصیر الدین چراغ دہلی تھے۔سلطان جی ان کو بوجہ کثرت علم ودانش ''گنجِ معانی'' کہا کرتے تھے۔انہیں کے خلیفہ ومرید سید محمد ابن یوسف الحسنی الدہلوی تھے۔ جو گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں یہ اپنے پیر ومرشد کی وفات کے بعد جب ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۸ء میں گجرات کے رستے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دکن روانہ ہوئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے بہت سے مرید

ان کے ہمراہ ہو لیے اور اس قافلہ کے ساتھ سن ۸۱۵ھ میں حوالی حسن آباد، گلبرگہ میں فائز ہوئے۔ وہ زمانہ فیروز شاہ بہمنی کا تھا۔ بادشاہ کو جب فیروز آباد میں آپ کے آنے کی خبر ہوئی تو تمام ارکان وامرائے دولت اور اپنی اولاد کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا۔ بادشاہ کا بھائی احمد خاں خانخاناں جو بعد میں اس کا جانشیں ہوا، خواجہ بندہ نواز کا بہت بڑا معتقد ہو گیا۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی یہیں بسر کی اور سرزمینِ دکن کو اپنی تعلیم وتلقین سے فیض پہنچاتے رہے۔ حضرت، صاحبِ علم وفضل اور صاحبِ تصانیف بھی ہیں۔ آپ کا معمول تھا کہ نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف وسلوک کا درس دیا کرتے تھے اور گاہے گاہے درس میں کلام وفقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی و فارسی سے واقف نہ تھے، ان کے سمجھانے کے لیے ہندی (اردو) زبان میں تقریر فرماتے تھے۔''

(اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص:14)

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی چند کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جیسے معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود اور شکار نامہ اس رسالے کے علاوہ متعدد رسالے ہیں دار لاسرار، تمثیل نامہ، ہشت مسائل وغیرہ یہ تمام رسائل تصوف کے اہم موضوع پر لکھے گئے ہیں لیکن کوشش بسیار کے باوجود ان رسائل کے سال تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا۔

﴿۱﴾ تفسیر کلام پاک (قرآن پاک کے ابتدائی پانچ پاروں کی تفسیر ہے)

﴿۲﴾ شرح مشارق الانوار (حدیث کی مشہور کتاب ''مشارق الانوار'' کی عالمانہ تفسیر ہے)

﴿۳﴾ شرح آداب المریدین

﴿۴﴾ شرح فصوص الحکم (شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف ہے)

﴿۵﴾ رسالہ استقامۃ الشریعت بطریقۃ الحقیقت

درج بالا کتب ورسائل کے علاوہ آپ کی ایک نظم چکی نامہ بھی ہے جو لازوال شہرت کی حامل ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر خلیق انجم رقم طراز ہیں۔

''حضرت خواجہ بندہ نواز فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ان کا فارسی دیوان گلبرگہ سے شائع ہو چکا ہے۔ دکنی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم "چکی نامہ" ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے، جس کی نقل میرے کرم فرما جناب محیی الدین صاحب قادری زور نے میری درخواست پر ارسال فرمائی ہے۔ اس نظم کے علاوہ بھی کچھ کلام ملتا ہے۔ میں نے تمام دکنی کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ حضرت کا فارسی میں کوئی خاص تخلص نہیں تھا.....القاب اور کنیت کے ساتھ ان کا پورا نام "صدر الدین ابوالفتح سید محمد حسینی گیسو دراز تھا۔''

(مقدمہ معراج العاشقین، مرتبہ: خلیق انجم، ص:۸۴)

06.09 چکی نامہ

یہ نظم کل ۱۲ بندوں پر مشتمل ہے اور چکی نامہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ تذکرہ اردو مخطوطات کے مرتب ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہے۔ چکی نامہ سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

دیکھو واجب تن کی چکی — پیو چاتر ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی — کہے بسم اللہ ہو، ہو اللہ
الف اللہ کا دستا — نے محمد ہو کر بستا
پہنچی طلب یوں کو دستا — کہے بسم اللہ ہو، ہو اللہ
دانے ہی سو چن چن لانا — شاید ہاتوں سے لے کر بہانا
شریعت سے چملکی یہی — کہے بسم اللہ ہو، ہو اللہ
الف اللہ اس کا بولوں — پیر مرشد صلک جالو
شپونا اس ہے چہانو — کہے بسم اللہ ہو، ہو اللہ
لا دم وجود باسن ہونا — اسی تو بہ ستی دھونا
ذات کی پانے سو آملی کو نہنا — کہے بسم اللہ ہو، ہو اللہ

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنا تخلص شہباز بھی استعمال کیا ہے جیسے۔

شہباز دو جانام جب جیو اپرے آؤں میں — آرے تے سر تا پاؤں لک آپش چڑاؤں دوئے کر

06.10 سید محمد اکبر حسینی

یہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی پیدائش دلی میں ہوئی۔ آپ کا شمار بھی جید علما و فضلا میں ہوتا ہے۔ دلی سے ہجرت کر کے ۸۱۵ھ میں گلبرگہ تشریف لے کر آئے۔ آپ نے اپنے والد گرامی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ لیکن مشیت الٰہی کم عمری میں ہی مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا انتقال ۸۲۳ھ میں ہوا۔ آپ کی تدفین گلبرگہ میں عمل میں آئی۔ آپ نے نثر و نظم میں دست رس حاصل کی فی الوقت آپ کی ایک کتاب دستیاب ہے جس کو مولوی محمد باقی نے ترتیب دے کر اپنے تعارفی نوٹس کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سید محمد اکبر حسینی کی نثر کا نمونہ درج ذیل پیش ہے:

> ''سنو اے مسلمانوں طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیوں کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سون آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سون آگے۔ یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت ہوں آپس کو پاک کرنا۔ ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عافیت کی راہ سنوارنا۔ اس باب میں حق سبحانہ تعالی نے قرآن مجید میں کہا ہے۔ اپنے حبیب کو خبر دیتا ہے۔۔ انا ارسلنک۔۔ الخ جس کوں

پیر نہیں اسے دین نہیں۔ جسے دین نہیں تو اسے بوج نہیں۔ اسے عشق نہیں،، ہور جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں
ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں اور بے پیر ہو کر رہنا کفر ہے۔''

(دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، صفحہ۔۵۷)

06.11 نظامی بیدری

نظامی بیدری کا اصل نام فخر دین اور تخلص نظامی تھا۔ نظامی نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں اپنے پورے نام فخر دیں کے ساتھ ساتھ اپنا تخلص نظامی استعمال کیا ہے۔

کہے فخر دیں ایک ساچا بچن — پہلے پرکھے جے کرے کوی کن
سنیوئے فخر دیں توں بسر آنکھیا — محمد نبی خاتم انبیا
نظامی کہنہا رجس یار ہوئے — سنہا رسن نغز گفتار

نظامی بیدری کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں کسی بھی تذکرہ و تاریخ میں نظامی کے احوال زندگی سے متعلق معلومات حاصل نہیں ہوتی ہے۔ نظامی احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں بیدر میں مقیم تھا۔ نظامی کو فارسی زبان پر بھی ملکہ حاصل تھا اسی وجہ سے اس نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے تمام تر عناوین فارسی زبان میں تحریر فرمائے ہیں۔

06.12 مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

نظامی بیدری نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھ کر اردو ادب کو ایک بیش بہا تحفہ عطا کیا ہے۔ اس مثنوی کو اردو زبان کی پہلی مثنوی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ی یہ مثنوی احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو نظامی نے ۱۴۲۱ء ۸۲۵ھ اور ۱۴۳۵ء ۸۳۹ھ کی درمانی مدت میں تصنیف کیا تھا۔ سب سے پہلے جمیل جالبی نے اسے ایک طویل مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۸ء میں ترتیب دیا، جسے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی توسط سے شائع کیا گیا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے ابتدائی اور آخری صفحات غائب ہیں جس وجہ سے اس کا اصلی نام کیا تھا اس بات میں شبہ پیدا ہو گیا۔ اس مثنوی میں دو اہم مرکزی کردار۔ کدم راؤ۔۔ پدم راؤ ہیں۔ اس میں پہلا کردار کدم راؤ ایک راجہ ہے جبکہ دوسرا کردار پدم راؤ راجہ کا وزیر ہے۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی نے انہیں دو کرداروں کو بنیاد بنا کر اس کا نام مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' رکھ دیا ہے جسے قبول عام حاصل ہوا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں اشعار کی تعداد:

نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۸۲۵ بتائی ہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق میں اس اختلاف کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ جمیل جالبی نے اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ بتائی ہے اور اس کا ۱۰۳۳ واں شعر نامکمل ہے۔ اس کی بحر متقارب مفرد مثمن محذوف ہے۔ اس کے ارکان فعولن، فعولن، فعولن، فعل ہیں۔

مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد نعت رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے اشعار ہیں پھر اس کے بعد سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ کے عنوان سے بہمنی سلطنت کے بانی کی مداحی میں اشار لکھے ہیں۔

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاہ جگ
رہیں سیوتے جرم تس پائے لگ
انہیں شہ کیا شاد دکھن دھرن
گگن دل دھرت دل مسخر کرن

06.13 مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ:

اس قصہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ کدم راؤ (جو ہیرانگر کا راجہ) اپنے وزیر (پدم راؤ) سے مخاطب ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی بات کرنا اچھی بات نہیں۔اس لئے پہلے غور وخوض کر لینا چاہیے۔راجہ وزیر سے کہتا ہے کے جو کچھ میں نے تجھ سے کہا ہے اس پر خوب غور وفکر کر کے جواب دے۔(راجہ نے اپنے وزیر سے کیا بات کہی تھی یہ مثنوی میں واضح نہیں ہے)

یہ کہہ کر راجہ غصّے کی حالت میں اپنے محل کی طرف چلا جاتا ہے۔راجہ کدم راؤ جب سنگھاسن پر وِراجمان ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر محل کی رانیاں اور کنیزیں گھبرا جاتی ہیں۔ ہر ایک حتی المقدور کدم راؤ کو منانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود۔راجہ کی یہ حالت دیکھ کر جب رانی نے اس کا ہاتھ پکڑا تو راجہ نے اس سے پوچھا ''اور باتیں چھوڑ یہ بتا کہ ناگن نے کیا چھند کیا؟'' اس کے بعد راجہ نے رانی سے کہا کہ غیر عورت کے ساتھ برا کام کرنے سے بدتر کچھ نہیں ہے۔اسی مرد کا نام دنیا جہاں میں روشن ہوتا ہے جو پرائی عورت کو اپنی ماں بہن سمجھتا ہے۔راجہ کدم راؤ رانی سے کہتا ہے،عورت بہت فریب جانتی ہے۔ایک فریب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔راجہ نے ایک اعلی ذات کی ناگن کو کم ذات کوڑیال سے میل کھاتے دیکھ لیا تھا۔

کدم راؤ سے دیکھا نہیں گیا اور اس نے غصّے میں تلوار نکال کر سانپ کو مار دیا لیکن ناگن جان بچا کر بھاگ جاتی ہے مگر تلوار کے وار سے اس کی دم کٹ جاتی ہے۔یہ دیکھ کر راجہ کا عورت ذات سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔اور رانی سے کہتا ہے۔۔اس واقعہ کے بعد اے رانی! مجھے تیرا بھی اعتبار بھی نہیں رہا۔سونے کی چھری بھی پیٹ میں نہیں ماری جاتی۔سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔اور دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک مار مار کر پیتا ہے۔راجہ کی باتیں سن کر رانی بے چین ہو جاتی ہے اور ڈرتے ڈرتے راجہ سے کہتی ہے،اگر آپ سنے تو میں ایک بات کہوں۔۔جو کچھ تو نے سنا وہ سچ ہے لیکن اچّھائی اور برائی دنیا کا حصّہ ہیں۔اگر میں قصوروار ہوں تو میں جان دینے کو تیار ہوں لیکن کسی دوسرے کا قصور میرے سر نہ ڈال۔کون سا مرد ہے جسکا پیر نہیں ڈگمگاتا ہے؟ اگر تو اُپواس رکھے گا تو تیری رعایا بھوکو مرے گی اور محل بھی فاقہ کرے گا۔تجھے تو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنی چاہیے،تاکہ بھلائی کے بدلے تجھے بھی بھلائی ملے۔

رانی راجہ کے سمجھانے کی پوری کوشش کرتی ہے لیکن راجہ کا دل بری طرح زخمی ہے وہ رانی سے کہتا ہے۔۔تو نے شوہر پرستی کی جو بات کہی وہ بالکل سچ ہے لیکن شکستہ دل کا کوئی علاج نہیں ہے۔عورت اسی وقت تک عقل مند رہتی ہے جب تک وہ کسی دوسرے مرد پر نظر نہ ڈالے۔

اس کی بعد راجہ کدم راؤ اپنے وزیر پدم راؤ سے کہتا ہے کہ میں اسی کو دوست جانتا ہوں جو بلا حرص ولالچ دوستی کے فرائض نبھا سکے۔پدم راؤ کدم راؤ کی زبان سے یہ باتیں سن کر خوش ہوا اور کہا کہ اگر راجہ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد رکھتا ہے تو میرے ماتھے پر کستوری ملے تاکہ میں اپنے گھرانے میں عزت کے ساتھ واپس جاؤں اور دنیا میں میرا نام روشن ہو،کدم راؤ نے اس کی پیشانی پر کستوری ملی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔پہلے ناگ

کے سر پر پدم نہیں تھا۔ یہ اسی وقت سے پیدا ہوا جب کدم راؤ نے اپنا ہاتھ پدم راؤ کے سر پر رکھا۔۔ وزیر راجہ سے پوچھتا ہے کہ مجھے علم ہوا ہے کے آپ رات سے اُپواس پر ہیں۔ جب آپ کو کوئی رنج ہوگا تو یقین جانو۔ پورا ملک پریشان ہو جائے گا۔ پدم راؤ رراجہ سے اُپواس نہ رکھنے کی گزارش کرتا ہے۔

کدام راؤ اپنے وزیر سے کہتا ہے۔ میں اب تک پردیسیوں کی خدمت سے محروم رہا ہوں راجہ وزیر سے کسی پردیسی کو لانے کے لئے کہتا ہے تا کہ اس کی خدمت کر کے فیض یاب ہو سکے۔ راجہ کے اس ارادے پر وزیر کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے قریب مت رکھ یہ آس (امید) دے کر نراس (نامید) کر دیتے ہیں۔ کدم راؤ کسی بدیسی کو محل میں مدعو کر کے خدمت کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔

کسی درباری نے مچھندر کا بیٹا اکھر ناتھ جو بھوت بادہ جوگی تھا۔ اس کو محل میں بلانے کا مشورہ دیا۔ اکھر ناتھ بہت سارے علوم سے واقفیت رکھتا تھا۔ کدم راؤ نے اس کو فوراً دربار میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ اکھر ناتھ راجہ کے دربار میں پیش ہوتا ہے۔ راجہ نے اس سے پوچھا تو کون کون سے علوم جانتا ہے۔ اکھر ناتھ نے اس بات کے جواب میں بے حد لاف زَنی کی اور راجہ کو ایسا محسور کیا کہ وہ اس کا گرویدہ ہو کر رہ گیا۔ اکھر ناتھ نے راجہ سے کہا کہ میں لوہے کو سونا بنا سکتا ہوں تو کدم راؤ نے لوہے کا ڈھیر جمع کر دیا جسے گھور ناتھ نے سونا بنا دیا۔ راجہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے بعد راجہ کو "دھنور بید" کی تعلیم دی جسے کدم راؤ نے ایک مہینے میں سیکھ لیا۔

اکھر ناتھ کہتا ہے کہ دھنور بید تو معمولی بات ہے میں تو آپ کو "اَمر بید" بھی سکھا سکتا ہوں۔ اگر تو مجھ سے وعدہ کرے کہ کسی اور کو نہیں سکھائے گا تو میں سکھا دوں گا۔ وہ راجہ سے کسی جانور کو لانے کے لیے کہتا ہے۔ اکھر ناتھ اس کا گلا چبانے کے لیے کہتا ہے۔ میں ابھی کرامات دکھاتا ہوں۔ راجہ اس طرح کرتا ہے جس سے طوطا مر جاتا ہے۔ جوگی اپنی روح کو طوطے کے مردہ جسم میں منتقل کر دیتا ہے۔ اور راجہ کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ در بعد پھر سے اپنے جسم میں آ جاتا ہے اور طوطا بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر راجہ اس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہو جاتا ہے۔ راجہ جوگی سے اس منتر کو سکھانے کا اصرار کرتا ہے۔

لوگوں نے راجہ سے اس بات سے باز رہنے کی گزارش کی، لیکن راجہ نے ان کی پرواہ نہیں کی۔ جوگی نے راجہ کو اس منتر کو سکھایا، اور پھر اس کا تجربہ کرنے کے لیے کہا۔ راجہ منتر کی مدد سے اپنی روح کو طوطے کے جسم میں منتقل کرتا ہے جوگی اپنی روح کو راجہ کے جسم میں داخل کر کے خود راجہ بن جاتا ہے۔

کیونکہ جوگی کو محل کی تفصیلات معلوم نہیں تھیں اس وجہ سے کافی پریشانی کا سامنا کرتا ہے۔ جوگی کے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ طوطا زندہ رہا اس لے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے اس کے مارنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ لیکن پدم راؤ اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔

اصلی راجہ طوطے کی شکل میں بیاباں و جنگلات میں جان بچا کر پھرتا رہتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے ہی محل کی چھٹ پر گزر رہا تھا۔ وہ اسکے اندر جاتا ہے اور اپنے وزیر سے کہتا ہے میں کدم راو ہوں جوگی نے میرے جسم اپنی روح داخل کر لی ہے میرے ساتھ اس نے بہت فریب کیا ہے۔

ایک رات موقعہ پا کر پدم راؤ سوتے ہوئے جوگی کے پاؤں کی انگلی میں ڈس لیتا ہے، ڈستے ہی زہر اس کے جسم میں چڑھنے لگا۔ اور اگھور ناتھ کی روح کدم راؤ کے جسم کو چھوڑ کر پرواز کر جاتی ہے۔ اس کے بعد پدم راؤ امر بید کا استعمال کر کے اپنے اصلی روپ میں آجاتا ہے۔

راجہ کدم راؤ نے خوش ہو کر اپنے وزیر پدم راؤ کی عزت افزائی کی۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ جشن منانے کا یہ سلسلہ چھ مہینے تک جاری رہا۔ پھر راجہ اپنے محل میں گیا اور سنگھاسن پر بیٹھا۔ اس کے بعد کا حصہ مخطوطے میں نہیں ہے، ضائع ہو گیا۔

06.14 صدرالدین

بہمنی دَور کے ایک اور شاعر شاعر صدرالدین ہیں۔ صدرالدین ایک بزرگ تھے۔ حضرت بدرالدین چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے شہر ناسک میں سکونت اختیار کی۔ ۸۷۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کی ایک کتاب ''کسب محویت'' آپ کی تصنیف دستیاب ہوئی ہے۔ اس کتاب میں روح، احدیت، محویت وغیرہ جیسے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

ناؤں لے اللہ محمد کا اول — کسب کا سب کو کہوں در ہر محل
گوش جاں سوں اب سنو صاحب یقین — کیا کہتا ہے نظم میں شہ صدرالدین
اولاً بانفس و دل قطب مثال — خواہش دانائی کا تو بوج حال
کامیاب کوں یہاں تے ہے — راہ وصل راہ الاتصال ذوالفضل

06.15 مشتاق

مشتاق سلطان محمد شاہ بہمنی کے دور حکومت میں موجود تھا۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں ہی شہرت حاصل کی۔ سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں اس نے ایک قصیدہ لکھا تھا۔ مشتاق اپنے دور کا ایک باکمال شاعر تھا۔ اس کے کلام کا ایک نمونہ درج ذیل پیش ہے۔

اوکسوت کیسری کرتن چمن میانے چلی ہے آ — رہے کھلنے کو تیوں دستی او چنپکی کلی ہے آ
سورج مرجان میں جیوں دستا نظروں کا نپتی تھر تھر — جولٹ پیچاں بھری سر تھے اور رخ او پر ڈھلی ہے آ
کھیا مشتاق فارسی سوں رہتے تم کان جو میں آؤں — کھی دان گھرا ہے برا کن کی جان گلی ہے آ

06.16 لطفی

لطفی مشتاق کا ہم عصر شاعر تھا۔ اس نے حضرت محمد شاہ کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔ لطفی کے قصائد اور غزلیات دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کے کلام کا نمونہ درج ذیل پیش ہے۔

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں — یک پاؤں پر کھری ہوں جلنے پرت پتی ہوں
سب نس گھری جلوں گی جا گا سوں نا ہلوں گی — نا جل کو کیا کروں گی اول سوں مدمتی ہوں
لطفی تیرے جلن کی پا کی کہاں ہے اس میں — جیوں پانچ پانڈواں کے کھتے سود ہر پتی ہوں

06.17 خلاصہ

مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی شکل وجود میں آئی تو اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ اس دور میں ہند یا یعنی ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو الہندی'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو "زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کی گئی۔

علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ جب گجرات پہنچی تو گجری کہلائی۔ خلجی اور تغلقی فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ ولی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوبارہ دلی پہنچتی ہے تو ریختہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہی لشکر میں جب وہ رہنے لگی تو اردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بھنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔ اردو زبان کا آغاز شمالی ہندوستان (North India) سے ہوا۔ شمالی ہندوستان میں پنجاب کے مختلف علاقے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس وقت پنجاب میں محمود غزنوی اور محمد غوری کی حکومتیں قائم تھیں۔

بہمنی سلطنت محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں ہونے والے اِنتشار کا نتیجہ تھی۔ اُمرائے گجرات کے ساتھ ساتھ گلبرگہ، دولت آباد کے رؤسا نے سلطان کے خلاف آواز بلند کر دی تھی۔ محمد بن تغلق کے دور حکومت میں ہر ایک موضع میں ایک ایک افسر کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان افسران کو اَمیران صَدّہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اَمیرانِ صَدّہ کی اکثریت دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آ کر مقیم ہوئی تھی۔ اَمیران صَدّہ اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے دکن اور گجرات کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ حکومت نے مال گزاری کی ذمے داری اَمیران صَدّہ کے سپرد کر رکھی تھی۔ انہوں نے دکن اور گجرات میں سکونت اختیار کرنے کے بعد مقامی زبان کو ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ بنایا تھا۔ اسی زبان کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بعدازاں یہی مقامی زبان رابطہ کی زبان بن جاتی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔ آپ کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی اس کے بعد ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لے آئے۔ میراں جی کو سب سے پہلے مستقل شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ نے خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق، مغز مرغوب کتابیں لکھیں۔ آپ کے علاوہ بندہ نواز گیسو دراز نے بھی اردو ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ آپ کی چند اہم کتب دستیاب ہوئی ہیں جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود قابل ذکر ہیں۔ چکی نامہ آپ کی اہم نظم تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ نظم کل ۱۲ بندوں پر مشتمل ہے۔

نظامی بیدری کا اصل نام فخر دین اور تخلص نظامی تھا۔ نظامی نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں اپنے پورے نام فخر دیں کے ساتھ ساتھ اپنا تخلص نظامی استعمال کیا ہے۔ نظامی بیدری نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھ کر اردو ادب کو ایک بیش بہا تحفہ عطا کیا ہے۔ اس مثنوی کو اردو زبان کی پہلی مثنوی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ مثنوی احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو نظامی نے ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء اور ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء کی درمانی مدت میں تصنیف کیا تھا۔ سب سے پہلے جمیل جالبی نے اسے ایک طویل مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۸ء میں ترتیب دیا، جسے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس میں ایک راجہ کدم راؤ اور اس کے وزیر پدم راؤ کی داستان بیان کی گئی ہے۔

جمیل جالبی نے اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ بتائی ہے اور اس کا ۱۰۳۳ واں شعر نامکمل ہے۔ اس کی بحر متقارب مفرد مثمن محذوف ہے۔ اس کے ارکان فعولن، فعولن، فعولن، فعل ہیں۔ اس مثنوی کے اہم کردار راجہ کدم راؤ، وزیر پدم راؤ، رانی، جوگی اکھر ناتھ اور اس کا باپ مجھندر ناتھ ہیں۔

06.18 فرہنگ

اپواس	: ہندو سماج کا خاص روزہ، وِرَت	سلاطین	: سلطان کی جمع
ارکان	: رکن کی جمع	عہد زریں	: ترقی و عروج کا زمانہ
استعداد	: قابلیت	عہد طفولیت	: بچپن کا زمانہ
اکتساب	: حاصل کرنا	علما	: عالم کی جمع
انتشار	: بکھراؤ، پھیلاؤ	فضلا	: فاضل کی جمع
ترویج	: نشر و اشاعت کرنا، پرچار کرنا	فلاحی	: قوم و سماج کی خدمت
تفتازان	: ایران میں صوبہ خراسان کا ایک تاریخی گاؤں	فیاضی	: سخاوت، دریا دلی
تلقین	: ہدایت، نصیحت	کوڑیال	: چتکبرا سانپ
تمدن	: سماجی زندگی	مشعل راہ	: وہ مشعل جو راہ میں راستہ دکھانے کا کام کرتی ہے
تنازع	: کھینچ تان کی حالت		
چھند	: فریب، دھوکہ، عیاری، مکاری	مشیتِ الٰہی	: اللہ تعالی کی مرضی
دارالحکومت	: راجدھانی	معاشرتی	: معاشرت سے متعلق، سماجی
دست گاہ	: ملکہ حاصل کرنا، مہارت	معتقدین	: عقیدت رکھنے والے
رشد و ہدایت	: نیک اور سیدھا راستہ دکھانا	نراس ہونا	: ناامید ہونا

06.19 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : بہمنی سلطنت پر مختصر تحریر قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : محمد شاہ ثانی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

سوال نمبر ۳ : خواجہ بندہ نواز کے متعلق مختصر تحریر قلم بند کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے متعلق جامع تحریر قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں کل کتنے کردار ہیں تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : میراں جی شمس العشاق کے متعلق اپنی معلومات کو تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اردو زبان کا آغاز کہاں ہوا؟

(الف) شمالی ہندوستان (ب) مغربی ہندوستان (ج) جنوبی ہندوستان (د) مشرقی ہندوستان

سوال نمبر۲ : علاءالدین حسن بہمن خاندان بہمنیہ کا کون سا سلطان تھا؟

(الف) دوسرا (ب) پہلا (ج) تیسرا (د) چوتھا

سوال نمبر۳ : محمد شاہ کس کا بیٹا تھا؟

(الف) محمود شاہ (ب) حامد شاہ (ج) علاءالدین (د) محمد حسن

سوال نمبر۴ : میراں جی شمس العشاق کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟

(الف) کشمیر (ب) مکہ مکرمہ (ج) گلبرگہ (د) شیراز

سوال نمبر۵ : خوش نامہ کس کی کتاب ہے؟

(الف) میراں جی شمس العشاق (ب) بندہ نواز گیسو دراز (ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) عبادت بریلوی

سوال نمبر۶ : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کس کی مثنوی ہے؟

(الف) نظامی (ب) وجہی (ج) غواصی (د) مقیمی

سوال نمبر۷ : مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں کل اشعار کی تعداد کتنی ہے؟

(الف) 1022 (ب) 1032 (ج) 1036 (د) 1031

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) شمالی ہندوستان جواب نمبر۲ : (ب) پہلا

جواب نمبر۳ : (الف) محمود شاہ جواب نمبر۴ : (ب) مکہ مکرمہ

جواب نمبر۵ : (الف) میراں جی شمس العشاق جواب نمبر۶ : (الف) نظامی

جواب نمبر۷ : (ب) 1032

06.20 حوالہ جاتی کتب

۱۔ دکن میں اردو از نصیرالدین ہاشمی

۲۔ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی

۳۔ اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق

۴۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ از نظامی بیدری

۵۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ از مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی

۶۔ مقدمہ معراج العاشقین از مرتب خلیق انجم

۷۔ تاریخ دکن بہمنی سلطنت از عبدالمجید صدیقی

اکائی 07 : قطب شاہی عہد میں اردو ادب

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : قطب شاہی دَور کا تہذیبی وادبی پس منظر

07.04 : قطب شاہی دَور کے ادبی کارنامے

07.05 : قطب شاہی دَور میں نثری اصناف

07.06 : قطب شاہی دَور میں شعری اصناف

07.07 : خلاصہ

07.08 : فرہنگ

07.09 : نمونہ امتحانی سوالات

07.10 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

اس سبق میں ارضِ دکن کی ایک اور سلطنت گولکنڈہ کے قطب شاہی دَور کی لسانی وادبی خدمات کا جائزہ لیں گے۔ اراکینِ سلطنت اور شاہی خاندان کے چشم وچراغ جو بذاتِ خود ادب نواز ہی نہیں شاعر بھی تھے انہوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں اور قطب شاہی دَور کا تہذیبی وسماجی پس منظر، درباری شعرا وادبا کی ادبی کاوشیں اور کئی اصنافِ ادب میں اوّلیت کا درجہ رکھنے والی نگارشات سے متعلق جان کاری شامل ہوگی۔ ایک ایسے باکمال ادیب وشاعر کا خصوصی ذکر بھی ہوگا۔ جس کی تصانیف کئی اعتبار سے اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں یعنی اسد اللہ وجہی۔ اس اِکائی میں آپ اُردو کی مشہور ومعروف اور قدیم مثنویاں ''قطبِ مشتری، سیف الملوک وبدیع الجمال اور پھول بن'' وغیرہ کی فنی خوبیوں سے بھی واقف ہوسکیں گے۔ اس پوری اِکائی کے مطالعے کے بعد آپ قطبِ شاہی دَور کے تمام معروف ومشہور شعرا وادبا کی نثری تصانیف سے بھی عمومی طور پر واقف ہوجائیں گے۔

07.02 تمہید

آپ یہ جان چکے ہیں کہ اس سلطنت کے عہد اور مغلیہ دَور میں شمال سے جنوب پر تسلط حاصل کرنے کی زور آزمائی چلتی رہی جس کی وجہ سے سلاطین، فوجیں، اُمرا اور رعایا کا شمال وجنوب میں آنا جانا لگا رہا۔ شمال میں جب مقامی زبانوں اور بولیوں میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو ایک نئی زبان کا آغاز ہوا اور نئی زبان دکن میں پہنچ کر وہاں کی مقامی زبان اور لسانی عناصر کے میل جول سے دکنی اُردو میں تبدیلی ہوئی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ آزاد ریاستیں قائم ہوئیں ان میں سے ایک گولکنڈہ کی ریاست تھی۔قطب شاہی سلاطین میں دکن کی سیاسی ،سماجی اور تہذیبی پس منظر کو ہی نہیں متاثر کیا بلکہ ادبی افق پر بہت سی ادبی اصناف کی رنگین دھنک کی تعمیر کی۔قطب شاہی دَور میں کسی ایک یا خاص صنف کی نہیں بلکہ اُردو ادب کے تمام اصناف کی ترویج وترقی ہوئی،خواہ وہ نثری اصناف ہو یا شعری۔اُردو ادب کی تاریخ میں قطب شاہی دَور کو معمولی اہمیت حاصل ہے۔

قطب شاہی حکمرانوں میں زیادہ تر کو شعروشاعری سے شغف تھا اور بعض کو تو شاعری کی کئی اصناف کے بنیادگزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔مثلاً: محمد قلی قطب شاہ،عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ وغیرہ۔قطب شاہی دَور کی ابتدا میں فیروز سید محمود اور مُلّا خیالی نے اُردو ادب کی آبیاری کی۔سلطان قلی قطب شاہ خود بڑا شاعر تھا جس نے اپنی تخلیقات میں غزلیں،قصائد،مثنوی،مرثیے،نظم،گیت تقریباً سبھی اصنافِ شاعری میں اپنے نمونے چھوڑے ہیں۔اس کے دَور کو دکن میں اُردو ادب کے عہدِ زرّیں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔وہ خود ایک قادرالکلام شاعر تھا جس کی کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اسی کے دَور میں ملک الشعرا مُلّا وجہی اور غواصی نے کئی ادبی شہ پاروں کی تخلیق کی۔

قلی قطب شاہ کے وارثین میں محمد قطب شاہ،عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بھی متعدد باکمال نثر نگار اور شعرا نے اُردو ادب کی اُفق پر اپنے جلوے دکھائے۔نشاطی،جنیدی،طبعی،فائز،خدانما،یعقوب اور عادل شاہ وغیرہ ان سب میں اہم ہیں۔قطب شاہی دَور میں اُردو زبان وادب کی بے پناہ خدمت انجام دی گئیں۔

اس دَور میں وجہی نے نثر ونظم دونوں میں بے مثال تصنیف ''سب رَس اور قطب مشتری'' چھوڑی ہیں۔اس عہد کی معروف مثنویوں میں ''میناست ونتی،سیف الملوک وبدیع الجمال،طوطی نامہ،پھول بن،لیلیٰ مجنوں،بہرام وگل اندام اور یوسف وزلیخا'' بھی ہیں۔شعرا نے اس دَور میں مثنوی کے علاوہ قصائد،مرثیے،غزلیں،رباعیاں اور دیگر اصنافِ شعری پر بھی کامیاب طبع آزمائی کی۔غرض یہ کہ قطب شاہی دَور ہر لحاظ سے دکن میں اُردو کا سنہرا دَور تھا۔

07.03 قطب شاہی دَور کا تہذیبی وادبی پس منظر

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا وجود ہوا جن میں اُردو زبان وادب کی سب سے زیادہ ترقی عادل شاہی (بیجاپور) اور قطب شاہی (گولکنڈہ) میں ہوئی۔گولکنڈہ میں اُردو زبان وادب کی ترقی میں ان اُدبا وشعرا نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جو دوسری ریاستوں سے گولکنڈہ میں ہجرت کر کے آ گئے تھے۔اُردو ادب کی ترقی کے اعتبار سے قطب شاہی دَور کا سولہویں صدی کا نصف آخر زیادہ اہم ہے۔قطب شاہی میں کل آٹھ بادشاہ ہوئے ہیں جن میں چار بذاتِ خود شاعر تھے اور شعرا وادبا کے مُربی وسرپرست تھے۔قطب شاہی دَور کا آخری بادشاہ قلی قطب شاہ بہت ہی قادرالکلام شاعر تھا اور تین زبانوں فارسی،اُردو اور تیلگو کا سرپرست اور شاعر بھی تھا۔قلی قطب شاہ کی ماں ایک تیلگو خاتون تھی گویا اس کی مادری زبان تیلگو تھی اور وہ اس زبان سے واقف ہی نہیں بلکہ تیلگو میں شاعری بھی کرتا تھا۔بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زور تیلگو میں اس کا تخلص ترکمان تھا لیکن تادم تحریر اس کی تیلگو شاعری کی خصوصیات کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوسکا ہے۔یہ اُردو کا پہلا شاعر ہے جس کے کلام کے قلمی نسخے ہندوستان کے کئی معروف کتب خانوں کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں میں بھی دَست یاب ہیں۔

شمالی ہند کے سب سے زیادہ معروف نظم کے شاعر نظیر اکبر آبادی کی طرح جنوبی ہند میں قلی قطب شاہ کو عوامی شاعر کا درجہ حاصل تھا جس نے ہندوستانی رنگ میں ڈوب کر ہندوستانی معاشرے کی رنگارنگی، حسن اور ماحول، تیج، تہوار اور موسموں مثلاً بسنت، شب برات، عید اور دیوالی میں بذاتِ خود شریک ہو کر اس کی تعریف میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ قلی قطب شاہ نے موجودہ عہد کے شعرا کی طرح موضوعی شاعری کی اور مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی خیالات و جذبات اور فلسفے کو فارسی صنائع و بدائع سے سجا کر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ تو کہنا مشکل ہے کہ اس نے شمال کے ہندی شاعروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا تھا یا نہیں لیکن اس کی ہندی تشبیہات، استعارات، صنائع و بدائع کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے واقف تھا۔

عصری لحاظ سے اس کا زمانۂ شاعری تقریباً وہی ہے جو شمال میں تلسی داس، سورداس اور میرابائی کا ہے۔ اس کی زبان سہل اور لسانی نقطۂ نظر سے بہت ہی مفید ہے۔ چند اشعار سے مذکورہ باتوں کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطبؔ شہ نہ دے مج دِوانے کو پند　　دِوانے کو کچ پند دِیا جائے نا
خبر لیایا ہے ہُد ہُد میرے تئیں اُس یارِ جانی کا　　خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا
ساقیا! آ شرابِ ناب کہاں　　چند کے پیالے میں آفتاب کہاں

قطب شاہی دَور کے ادبی پس منظر میں ان شعرا کا بھی نمایاں حصّہ ہے جو اس ریاست کی تشکیل کے آغاز میں دوسری ریاستوں سے آئے تھے مثلاً قطب الدین قادری جس کا تخلص فیروزؔ تھا دراصل وہ بیدر (Bidar) کا باشندہ تھا جو ابراہیم قطب شاہ کے دَور میں گولکنڈہ آیا تھا۔ اس نے اپنے پیر و مرشد شیخ محمد ابراہیم جی کی مدح میں مثنوی ''پرت نامہ'' کو لکھا۔

گولکنڈہ کے بلند پایہ شعرا محمد قلی قطب، ملا وجہی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروزؔ کا جس قدر احترام سے تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان معروف شعرا نے قطب الدین قادری فیروزؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ فیروز کی گولکنڈہ آمد دکنی اُردو کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو بعد کے زمانے میں دلّی میں ولؔی کی آمد کی ہے۔ فیروز کی طرح سید محمود کا شمار قطب شاہی دَور کے اوّلین شعرا میں ہوتا ہے اسے بھی وجہی، قلی اور نشاطی نے عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ محمود کے کلام کا مخطوطہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس قادر الکلام شاعر نے دکنی اُردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی زبان میں بھی شعر کہے ہیں لیکن اس کی مقبولیت دکنی اُردو کی وجہ سے ہی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو جلد اوّل میں محمود کی غزلوں کے اشعار منتخب کیے ہیں۔ مذکورہ دو ابتدائی شعرا کی طرح ہی ملا خیالی کا بھی دکنی اُردو کے ابتدائی دَور بڑا اہم مقام ہے۔ ملا خیالی کا تذکرہ ابن نشاطی اور سید اعظم نے اپنے کلام میں اس طرح کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بلند پایہ شاعر تھا مگر ملا خیالی کی صرف ایک غزل دَست یاب ہو سکی ہے۔ گولکنڈہ کے شعرا نے اُردو کی ہر مروجہ اصناف میں یادگار تصانیف چھوڑی ہیں جنھوں نے بعد کے اُردو ادب کی ترقی کی راہیں ہم وَار کیں۔ دبستانِ گولکنڈہ کا ایک ایسا باکمال شاعر اور نثر نگار بھی تھا۔ جس نے 'تاج الحقائق اور سب رس' جیسی نثری تصنیف کے علاوہ اپنی معروف مثنوی 'قطب مشتری' کی بھی تصنیف کی ہے۔

07.04 قطب شاہی دَور کے ادبی کارنامے

قطب شاہی عہد کے ابتدائی شعرا میں قطب الدین قادری فیروز، سید محمود، ملا خیالی کے علاوہ معروف شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، ملکِ الشعرا اسداللہ وجہی، ملک الشعرا غواصی، ابن نشاطی کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان شعرا کے علاوہ کچھ ایسے شاعر اور نثر نگار بھی قطب شاہی دَور کی یادگار ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف سے ابتدائی اُردو ادب کو مالا مال کیا۔ ان شعرا و ادبا میں شیخ احمد جو احمد گجراتی کے نام سے مشہور ہیں۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ، احمد جنیدی، قطب رازی، میراں جی حسن خدانما، میراں یعقوب، حضرت شاہ راجو حسینی اور عابد شاہ وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔

قلی قطب شاہ کی ولادت ۹۷۳ھ تخت نشینی ۹۸۸ھ اور وفات ۱۰۲۰ھ ہے۔ یہ گولکنڈہ سلطنت کا پانچواں بادشاہ تھا۔ پچھلے صفحات میں آپ اس کے متعلق پڑھ چکے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں اتنا تنوّع ہے کہ اسے ایک کثیر المحبوب شاعر کہا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی محبوباؤں: گوری، سانولی، چھبیلی، ننھی اور پیاری وغیرہ کے حسن کی تعریف مختلف نظموں و اشعار میں کی ہے۔

قلی قطب شاہ نے مختلف موضوعات مثلاً حمد و مناجات، نعت و منقبت، عید، شب برأت، نوروز، سال گرہ (برس گانٹھ)، برسات (مرگ) کو موضوع بنا کر شاعری کی ہے۔ اس نے اپنے دَور میں صنف غزل کی آبیاری کی۔ اس وقت دکنی میں مثنوی کا سکہ چل رہا تھا۔ قلی قطب شاہ نے اپنے عہد کے سماجی، معاشی اور معاشرتی ماحول کی بھرپور عکاسی و ترجمانی کی ہے۔ اس کے کلام میں عشقیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مذہبی، صوفیانہ رنگ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسداللہ وجہی جن کو ملا وجہی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے قطب شاہی ادب کا سب سے عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار تھا۔ وہ اپنی نثری اور شعری خدمات کے علاوہ بحیثیت بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکمت کے لئے مشہور تھا۔

وجہی کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کا حتمی سال معلوم نہیں لیکن گمان غالب ہے کہ وہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے عہد ۱۵۵۰ء سے ۱۵۸۰ء کے درمیان میں پیدا ہوئے اور اپنی وفات سے پہلے تین قطب شاہی سلاطین: محمد قلی قطب شاہ، قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ یعنی ۱۵۸۰ء سے ۱۶۷۲ء کا زمانہ دیکھا۔ وجہی نے اپنی تصانیف میں سب رس، مثنوی قطب مشتری کے علاوہ تاج الحقائق اور فارسی غزلوں کا دیوان بھی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اس نے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ وجہی کی قطب مشتری کے لئے مشہور ہیں کہ یہ طبع زاد مثنوی صرف بارہ دن میں لکھی گئی۔

ملا وجہی کی خداداد صلاحیتوں اور ادبی خوبیوں کا اعتراف اس کے ہم عصروں اور بعد کے شعرا و ادبا نے بھی برملا کیا ہے۔ کسی نے وجہی کو شاعروں کا سورج کہا ہے تو کسی نے اسے ''نپٹ عاقل، نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گن بھر'' کا خطاب دیا ہے۔ سب رس کے ایک قلمی نسخے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سلسلۂ چشتیہ کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ علی متقی کا مرید تھا۔ اس کے متعلق ایک اور حقیقت ہے کہ وہ کسی وقت شاہی عتاب کا شکار ہوا جس کی وجہ سے اسے تنگ دستی اور مفلسی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے وجہی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا اور اس دَور میں وہ بادشاہ کا دستِ راست تھا۔

قطب شاہی دَور کا ایک اور باکمال شاعر غواصی بھی ہے۔ غواصی کی تاریخِ پیدائش، تعلیم و تربیت اور سن وفات کا بھی حتمی زمانہ معلوم نہیں۔ کچھ شواہد سے ابراہیم قطب شاہ کے دَور میں ولادت اور قلی قطب شاہ کے دَور میں شعر گوئی کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ جب کہ سلطان

عبداللہ قطب شاہ کا دَور غواصی کی شاعری کا عہدِ زرّیں کہنا چاہیے۔اسی زمانے میں وہ ملک الشعرا بنایا گیا اور قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے ریاستِ بیجاپور بھیجا گیا۔غواصی ایک صوفی بزرگ میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ کا مرید تھا اس کے مدحیہ اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ غواصی نے چار مثنویاں ''مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ اور مثنوی طریقت'' کی تصنیف کی۔اس کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف میں غزلوں، نظموں، مرثیوں اور رباعیوں پر بھی طبع آزمائی کی۔ان اصناف پر مشتمل اس کا دیوان منظر عام پر آچکا ہے۔

غواصی دبستانِ گولکنڈہ کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔کیوں کہ اس کی شاعری میں بھرتی کے اشعار بہت ہی کم ہیں اور شعری جمالیات کے ساتھ ساتھ اس کے اشعار میں گہرا تاثر پایا جاتا ہے۔اظہارِ بیان میں سادگی، نغمگی، موسیقیت، سوز و گداز اور حقیقت نگاری اس کی غزلوں کے اشعار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔کل ملا کر غواصی کو قلی قطب شاہ کے بعد دکنی کا دوسرا اہم شاعر کہنا چاہیے۔غواصی کو اپنے فنی کمال کا شدید احساس تھا چناں چہ شاعری میں وہ کسی کو بھی اپنے برابر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔غواصی نے اپنی شاعری میں دوسری مثنویوں کی طرح ہی مافوق الفطرت عناصر، مقامی ماحول، تہذیب و تمدّن، انسانی جذبات و نفسیات، منظر نگاری اور سراپا نگاری کی تصویر کشی کی ہے لیکن دوسرے ہم عصر شعرا سے منفرد انداز میں۔اس کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا موازنہ شمال کی مثنوی سحر البیان سے کیا جاسکتا ہے۔

قطب شاہی دَور میں مذکورہ شعرا کے علاوہ ایک اور اہم شاعر ابن نشاطی ہے۔ابن نشاطی کا اصل نام شیخ محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین ابن نشاطی تھا۔اس کے متعلق مشہور ہے کہ قطب شاہی دَور کا باکمال انشا پرداز تھا لیکن بدقسمتی سے اس کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ اب دَست یاب نہیں۔ابن نشاطی اپنی مشہور و معروف مثنوی ''پھول بن'' کے لئے مشہور ہے جو دکنی اُردو کی چند مشہور مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ پھول بن کو ابن نشاطی نے صرف تین ماہ میں لکھا۔

اس کے ہم عصروں نے اسے قطب شاہی دَور کا فارسی و دکنی کا بہت بڑا عالم اور ماہر عروض و بلاغت لکھا ہے جسے فن شاعری میں خصوصاً صنائع و بدائع کے استعمال میں یدطولیٰ حاصل تھا۔آج بھی پھول بن کی زبان اور اس کی سلاست و روانی سے ابن نشاطی کی قادرالکلامی اور اس کے کمال فن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ابن نشاطی کی یہ مثنوی ۴۴۷/اشعار پر مشتمل ہے۔

قطب شاہی دَور کے دیگر شعرا و ادبا میں احمد گجراتی کا نام بہت ہی اہم ہے۔شیخ احمد اصلاً گجرات کا باشندہ تھا اور قلی قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ مدعو کیا گیا۔یہاں وہ احمد گجراتی کے نام سے مشہور ہوا۔احمد گجراتی کی دو مثنویاں ''لیلیٰ مجنوں اور مصیبتِ اہلِ بیت'' معروف و مشہور ہیں۔لیلیٰ مجنوں کے مخطوطے کو پروفیسر محمود شیرانی نے دریافت کیا تھا اور مصیبت اہلِ بیت کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے ذریعہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہونے کی بات کہی گئی ہے۔شیخ احمد گجراتی کی ایک اور مثنوی ''یوسف و زلیخا'' کا تعارف بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد میں کرایا ہے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اسے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔محققین نے یوسف و زلیخا کو دبستانِ گولکنڈہ کی پہلی مثنوی قرار دیا ہے۔

آپ جان چکے ہیں کہ گولکنڈہ کے سلاطین بذاتِ خود شاعر و ادیب تھے۔سلطان عبداللہ قطب شاہ جو ریاست گولکنڈہ کا چھٹا سلطان تھا دکنی اُردو کا باکمال شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کا ایک نامکمل دیوان جس میں ردیف (ث) تک کی غزلیں درج ہیں دریافت ہوا ہے۔اس دیوان میں کل ۹۷/غزلیں ہیں جن کے مطالعے سے عبداللہ قطب شاہ کی قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔گو کہ عبداللہ قطب شاہ نے مرثیے اور گیت

بھی لکھے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر تھا۔اس کے اشعار میں سادگی بیان،نغمگی ،موسیقیت اور صنائع وبدائع کے موزوں استعمال اس کی شاعرانہ پختگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔عبداللہ قطب شاہ کا دیوان بہت ہی مقبول ہوا اور دوبار شائع ہو چکا ہے۔عبداللہ قطب شاہ کے دور کا ایک اور شاعر احمد جنیدی ہے جس نے ۱۰۶۴ھ میں اپنی مثنوی ''ماہِ پیکر'' تصنیف کی۔جس میں ۲۷۳۵/اشعار ہیں۔مثنوی ماہِ پیکر کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۹۸۶ء میں مرتب کر کے جامعہ عثمانیہ سے شائع کیا۔

اسی دَور میں ایک اور معروف شاعر قطب رازی کا پتہ چلتا ہے جس نے اپنے مرشد کی فرمائش پر خواجہ بندہ نواز کے والد حضرت یوسف شاہ راجو حسینی کی فارسی کی مشہور تصنیف ''تحفۃ النصائح'' کا دکنی اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔تحفۃ النصائح قصیدے کی ساخت میں ایک طویل نظم ہے جو ۱۷۸۶/اشعار پر مشتمل ہے۔عبداللہ قطب شاہ کے دَور کے دیگر ادبا وشعرا نے میراں جی حسن خدانما، میراں یعقوب، حضرت شاہ راجو حسینی اور عابد شاہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔میراں جی حسن خدانما نے اپنے مریدوں کی رہنمائی کے لئے دکنی نثر ونظم میں کئی رسالہ لکھے جن میں ''شرح شرح تمہیدات عین القضاۃ، رسالۂ وجدیہ اور شرح مرغوب القلوب'' نثر یہ رسالے ہیں جب کہ ''بشارت الانوا اُردو مختصر مثنویاں اور دو غزلیں'' ان کی شعری تصانیف ہیں۔میراں یعقوب حضرت میراں جی خدانما کے مرید تھے وہ بیک وقت شاعر اور نثر نگار تھے۔انہوں نے حضرت رکن الدین عماد کی فارسی تصنیف ''شمائل الاتقیا'' کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا۔یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ۱۲۰۰/صفحات پر مشتمل ہے۔اسی زمانے کے باکرامت بزرگ اور نام وَر صوفی حضرت شاہ راجو حسینی جنہوں نے اپنے مریدوں بالخصوص گھریلو خواتین کی رشد وہدایت کے لئے دکنی اُردو میں ''سہاگن نامہ اور چکی نامہ'' لکھی ہیں۔ان دونوں تصانیف میں گھریلو خواتین کی تعلیم وتفہیم کے لئے آسان زبان میں مذہبی احکام کی تفہیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قطب شاہی کے آخری دَور میں عابد شاہ نام کے ایک بزرگ جو بیک وقت شاعر اور نثر نگار دونوں تھے ان کی کئی تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔عابد شاہ کا پورا نام نواب الدین اور تخلص عابد تھا۔انہوں نے ''مرأۃ السالکین اور گلزار السالکین'' کے نام سے دو نثری کتابیں لکھیں۔ان کی ایک اور شعری تصنیف کنز المومنین کے نام سے معروف ہے جو فقہ حنفی پر مبنی ایک منظوم رسالہ ہے۔ان کے علاوہ قطب شاہی دَور میں دو شعرا طبعی اور فائز کا ذکر ملتا ہے۔طبعی نے ''بہرام وگل اندام'' کے نام سے مثنوی لکھی تھی۔ڈاکٹر نور السعید اختر نے اسے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ جب کہ فائز نے ''رضوان شاہ وروح افزا'' کے نام سے ایک دل چسپ مثنوی لکھی جسے سید محمد صاحب نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔اسی دَور کی دیگر مثنویاں ''معراج نامہ، وفات نامہ، ہدایاتِ ہندی، قصّۂ حسینی، قصص الانبیاء، جنگ نامہ اور قصّۂ ابوشحمہ قابل ذکر ہیں۔

07.05 قطب شاہی دَور میں نثری اصناف

قطب شاہی دَور کی نثری تصانیف اُردو کی ترویج وترقی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ملک الشعرا اسداللہ وجہی جتنا عظیم المرتبت شاعر تھا اتنا ہی باکمال نثر نگار بھی تھا۔اس کے ہم عصروں اور بعد کے شعرا وادبا نے اس کو ''گیانی، گن بھر، عاقل اور کامل'' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔وجہی نے دو مشہور نثری تصانیف ''تاج الحقائق اور سب رس'' اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔تاج الحقائق تصوّف کے موضوع پر ایک نثری رسالہ ہے جسے مولوی عبدالحق نے سب سے پہلے اپنی تحقیق کے ذریعے منظر عام پر لائے۔اس کتاب میں سلوک اور معرفت کے مسائل کو عام فہم زبان اور دل نشیں ومؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

تاج الحقائق کے متعلق محققین نے لکھا ہے:

''تصوّف کا یہ نثری رسالہ وجہی کا نقشِ اول ہے اور سب رس نقش ثانی۔ سب رس کے نقطۂ عروج تک پہونچنے کے لئے وجہی کو تاج الحقائق کی منزل سے گزرنا لازمی تھا۔''

مذکورہ نقد و تبصرہ سے وجہی کی دونوں تصانیف کی اہمیت کا پتہ ملتا ہے۔ سب رس سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی۔ سب رس کا قصّہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف ''قصّۂ حسن و دل'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن وجہی نے اپنی اس تصنیف میں اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور لسانی مہارتوں کا استعمال کرتے ہوئے اسے ایک تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔ سب رس کا شمار اُردو نثر کی چند منتخب تصانیف میں ہوتا ہے۔ اس کا اُسلوب مقفّٰی ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔ کئی منزلوں پر وجہی نے انسانی کیفیات اور رُموزِ کائنات کی حقیقتوں کو فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کتاب اُردو نثر کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

سب رس میں انسانی جذبات و احساسات، عقل و عشق اور حسن کے تمام لوازمات کے علاوہ ہمت و جواں مردی وغیرہ کی اس طرح پیش کش کی گئی ہے جیسے عصر حاضر کے ناولوں میں ان معاملات کو پیش کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ سب رس کا قصّہ تمثیلی ہے لیکن حقیقی زندگی سے قریب تر لگتا ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کے معاملات پورے قصے میں چلتے رہتے ہیں۔ سب رس میں آیات و احادیث، اشعار فارسی، مقولے اور روزمرّہ محاورے، تمثیل اور ضرب الامثال وغیرہ کا حسین امتزاج ہے۔ ان سب کی اس قدر بہترین پیش کش ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر اُٹھتا ہے۔ سب رس میں دی گئی معلومات، علوم، تجربات و احساسات، انسانی جذبات کے مطالعے سے وجہی کی ہنرمندی کا پتہ چلتا ہے۔ وجہی نے اس نثر پارے سے نظم و نثر کے امتزاج کی نئی بنیاد ڈالی۔

وجہی کے علاوہ قطب شاہی دَور میں کئی صوفیائے کرام نے دکنی اُردو میں نثری خدمات انجام دیں۔ ان صوفیا میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے مریدوں میں میراں جی حسن خدانما کا نام نثری خدمات کے لئے قابل ذکر ہے۔ حسن خدانما نے تصوّف کے مسائل پر تین رسالے قلم بند کیے ہیں۔ ''رسالۂ وجدیہ، شرح مرغوب القلوب اور شرح شرح تمہیدات و عین القضاۃ ہیں۔ عین القضاۃ فارسی تصنیف ہے جس کی شرح خواجہ بندہ نواز نے فارسی میں لکھی تھی اور اس شرح کا ترجمہ دکنی نثر میں کیا۔ جو کہ شرح شرح تمہیدات عین القضاہ کے نام سے مشہور ہے۔ رسالۂ وجدیہ، شرح مرغوب القلوب بھی تصوّف کے موضوع پر لکھے گئے رسالے ہیں۔ حسن خدانما کے علاوہ سید میراں یعقوب جو خدانما کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ نے بھی دکنی اُردو میں نثری خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے حضرت برہان الدین غریب کے خلیفہ حضرت رکن الدین عماد کی فارسی تصنیف ''شمائل الاتقیاء'' کا دکنی نثر میں اسی عنوان سے ترجمہ کیا۔ یہ نثری تصنیف ۱۲۰۰ر صفحات پر محیط ہے جس میں تصوّف کے مسائل کو صاف ستھرے اور سلیس زبان میں دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ میراں صاحب نے تصوف کے دقیق مسائل کو واضح کرنے کے لئے آسان تشبیہوں اور تمثیلوں کا سہارا لیا ہے۔ قطب شاہی دَور کے آخری عہد میں بھی نثری کارنامے انجام دیے گئے ان میں عابد شاہ کی مرأۃ السالکین اور گلزار السالکین نثری تصانیف دکنی نثر کا نمونہ ہیں۔

07.06 قطب شاہی دَور میں شعری اصناف

قطب شاہی عہد اُردو اصناف کے لئے زرّیں دَور سے منسوب ہے کیوں کہ اسی عہد میں اُردو کی مشہور و معروف مثنویاں لکھی گئیں جو شعری ادب کا بے بہا سرمایہ ہے۔ ایک اور بات جو اس عہد اور دبستان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ قطب شاہی سلاطین میں اکثر و بیش تر شاعر تھے اور جو شاعر نہ تھا وہ شعرا کی قدر و منزلت میں پیش پیش تھا۔ قطب شاہی سلطانوں میں قلی قطب شاہ کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی قادرالکلامی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کلیات میں پچاس ہزار اشعار شامل ہیں۔ اس کے دَور کے کئی شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اُردو کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں اور اپنے بعد بے مثل شعری تصانیف چھوڑی ہیں مثلاً ملک الشعرا وجہی، غواصی، ابن نشاطی وغیرہ۔ شعری اصناف میں اولین نمونے قطب الدین قادری فیروزؔ مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' ہے۔ سید محمود اور ملا خیالی کی غزلیں، قلی قطب شاہ کی نظمیہ شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسداللہ وجہی جو قطب شاہی دَور کا باکمال نثر نگار بھی ہے اس نے اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کی۔ وجہی کی یہ مثنوی اُردو ادب کا بہترین شعری نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ وجہی نے دو نثری خدمات ''تاج الحقائق اور سب رس'' کی شکل میں دی ہیں۔ قطب شاہی دَور کا ایک اہم شاعر جو اپنے زمانے میں ملک الشعرا اور قطب شاہی سلطنت کی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا شعری خدمات کے لئے بے حد مشہور ہے۔ غواصی نے چار مثنویاں ''مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ اور مثنوی طریقت'' لکھ کر اُردو کے شعری سرمایے میں بے بہا اضافہ کیا۔ غواصی نے مثنویوں کے علاوہ غزلیں، نظمیں، قصیدے، مرثیے اور رباعیاں بھی لکھیں۔ قطب شاہی دَور کی غزلیہ شاعری کا تذکرہ غواصی کی غزلوں کے بغیر نامکمل ہے۔ قطب شاہی دَور کے ایک اور اہم شاعر ابن نشاطی اپنی مشہور و معرف مثنوی ''پھول بن'' کے لئے بہت ہی مشہور ہے۔ ابن نشاطی کا اصل نام شیخ مظہرالدین شیخ فخرالدین ابن نشاطی تھا۔ اس کی قادرالکلامی اور انشا پردازی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پھول بن جیسی غیر معمولی مثنوی صرف تین ماہ میں لکھی۔

یہ مثنوی فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے جس میں ۱۷۴۴/ اشعار ہیں۔ اسی دور میں شیخ احمد جو احمد گجراتی کے نام سے مشہور ہیں غواصی اور وجہی کے دور میں گولکنڈہ آئے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے ان کی دو مشہور مثنویوں ''لیلیٰ مجنوں، مصیبتِ اہلِ بیت'' کا تذکرہ اپنی مشہور کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں کیا ہے۔ دبستانِ گولکنڈہ کا سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی اپنی شعری تخلیقات کے لئے مشہور و معروف ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ قطب شاہی دَور کا چھٹا سلطان تھا۔ یہ اصل میں غزل کا شاعر تھا اس کے نامکمل کلام (دیوان) میں الف سے ث تک ۹۷/ غزلیں درج ہیں۔ سلطان عبداللہ نے غزلوں کے علاوہ مرثیے اور گیت بھی اپنی باقیات میں چھوڑے ہیں۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دَور میں احمد جنیدی نام کے ایک شاعر نے ''ماہِ پیکر'' نام سے ۱۰۶۴ھ میں ایک مثنوی لکھی جس میں ۲۷۳۵/ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۹۸۶ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع کیا۔ اسی دَور کے صوفی شاعر قطب رازی نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد محترم حضرت یوسف شاہ راجو حسینی کی مشہور فارسی تصنیف ''تحفۃ النصائح'' کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ جو قصیدے کی ہیئت میں ایک طویل نظم ہے جس میں ۱۷۸۶/ اشعار شامل ہیں۔

مذکورہ شعری تصانیف کے علاوہ قطب شاہی دَور میں میراں جی خدانما کی ''بشارت الانوار'' ان کی دو مختصر مثنویاں اور دو غزلیں قابلِ ذکر ہیں۔ حسن خدانما کے مرید و خلیفہ میراں یعقوب بیک وقت شاعر اور نثر نگار تھے۔ قطب شاہی دَور کے آخر میں نواب الدین عابد شاہ جو صوفی منش آدمی تھے ایک منظوم رسالہ ''کنز المومنین'' کے نام سے لکھا۔ اس کے علاوہ طبعی نے ''بہرام وگل اندام'' اور فائز نے ''رضوان شاہ و روح افزا'' کے نام سے دل چسپ مثنویاں لکھیں۔ اس دَور کی دیگر مثنویوں میں سید بلاقی کی ''معراج نامہ''، عبدالطیف کی ''وفات نامہ''، ضعیفی کی ''ہدایاتِ ہندی''، خواص کی ''قصّۂ حسینی''، قدرتی کی ''قصص الانبیاء'' اور اولیا کی ''قصّۂ ابوشحمہ'' قابلِ ذکر شعری تصانیف ہیں۔

07.07 خلاصہ

دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جن پانچ ریاستوں کا وجود ہوا ان میں ایک ریاست گولکنڈہ کی بھی تھی۔ گولکنڈہ پر قطب شاہی سلطانوں نے ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک حکومت کی۔ قطب شاہی دَور حکومت میں اُردو زبان و ادب کی بے مثل ترویج و ترقی ہوئی چوں کہ قطب شاہی عہد سیاسی و سماجی لحاظ سے خوش حال اور پرسکون تھا اس وجہ سے دوسری ریاستوں کے علما و ادبا نے بھی یہاں آ کر سکونت اختیار کی اور اپنے علمی و ادبی کارنامے انجام دیے قطب شاہی سلاطین میں اکثر شاعر و ادیب تھے اور شعرا و ادبا و علما کے قدر دان تھے۔

قطب شاہی دَور کا مشہور سلطان محمد قلی قطب شاہ تو اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس نے موضوعی نظمیں، غزلیں اور دوسری اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ قطب شاہی دَور میں کچھ ایسے معرکۃ الآرا ادبی کارنامے انجام دیے گئے جن کی مثال کسی عہدِ حکومت میں مشکل سے ملتی ہے۔ اس عہدِ حکومت میں اسداللہ وجہی، غواصی، ابن نشاطی تین ایسے باکمال شاعر ہیں جنھوں نے اُردو ادب کو لازوال مثنویاں دی ہیں۔ اس زمانے کی مشہور مثنویوں میں قطب مشتری، مینا ست ونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ اور پھول بن ہیں۔ غواصی نے تو مثنویوں کے علاوہ غزلیں، قصیدے، نظمیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں ملک الشعرا وجہی عہد قطب شاہی کا باکمال شاعر ہی نہیں اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی تھا۔

وجہی کی تصنیف سب رس کا اُردو زبان کے ادب عالیہ میں شمار ہوتا ہے اور اس کی حیثیت اُردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی ہے۔ ان مشہور شعرا و ادبا کے علاوہ اس زمانے کے بہت سے صوفیائے کرام نے بھی اُردو کی بے بہا خدمات انجام دیں جن میں قطب رازی، میراں یعقوب، حضرت شاہ راجو حسینی اور عابد شاہ قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے نثری رسالے لکھ کر ایک طرف دینی خدمات انجام دیں تو دوسری طرف اُردو نثر کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ قطب شاہی دَور کے دیگر مثنوی نگاروں میں احمد گجراتی، جنیدی، طبعی اور فائز وغیرہ کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے اور غزل گوئی میں غواصی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ساتھ قلی قطب شاہ کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ قطب شاہی دَور کے آخری عہد میں سید بلاقی، عبدالطیف، مختار، ضعیفی، خواص، قدرتی اور اولیا جیسے شعرا نے کئی مثنویاں لکھیں جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ مجموعی طور سے قطب شاہی دَور کو نقاد ادب نے مثنویوں کے دَور سے موسوم کیا ہے تاہم مثنوی کے علاوہ بھی صنفِ غزل اور موضوعی نظموں کو اس دَور میں خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور دوسرے اصنافِ ادب نثری و شعری داستان، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کی صنف پر بھی خاص توجہ دی گئی۔

07.08 فرہنگ

آبیاری	:	پانی دینا، ترقی دینا	شعرا	:	شاعر کی جمع
الف لیلہ	:	ہزار راتیں، ایک داستان کا نام	طبع زاد	:	اپنی ایجاد یا اختراع
بزم	:	محفلِ نشاط	فی البدیہہ	:	بے سوچے، فوراً، فی الفور
بیش بہا	:	قیمتی	کچ	:	کچھ
تمثیل	:	تشبیہ دینا، مماثلت، مطابقت	کوں	:	کو
ٹھار	:	جگہ	گُن بھر	:	صاحب اوصاف
ڈائن	:	جادوگرنی	گیانی	:	عالم
رزم	:	میدان جنگ	نپٹ	:	مکمل
سلطنت	:	حکومت	نئیں پڑا	:	نہیں آیا
سوں	:	سے	یدطولیٰ	:	مہارت

07.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : غواصی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : محمد قلی قطب شاہ کی عوامی شاعری سے بحث کیجیے

سوال نمبر۳ : اُردو نثر کے ارتقا میں ''سب رس'' کا مقام متعین کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : قطب شاہی سلاطین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : قطب شاہی دور کا تاریخی و تہذیبی پس منظر بیان کیجیے

سوال نمبر۳ : تاریخ ادب اُردو میں شاعر و نثر نگار کی حیثیت سے وجہی کی خدمات کو اُجاگر کیجیے؟

07.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	از	پروفیسر احتشام حسین
۲۔	اُردو مثنوی کا ارتقا	از	عبدالقادر سروری
۳۔	تاریخ ادب اُردو جلد (اول)	از	ڈاکٹر جمیل جالبی
۴۔	تاریخ ادب اُردو ۱۷۰۰ء تک	از	پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین

۵۔ جامع اُردو انسائیکلوپیڈیا از قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان دہلی

۶۔ دکن میں اُردو از نصیرالدین ہاشمی

۷۔ غواصی شخصیت اور فن از محمد علی اثر

اکائی 08 : عادل شاہی عہد میں اردو ادب

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : عادل شاہی عہد کا تہذیبی وادبی پس منظر

08.04 : عادل شاہی عہد کے ادبی کارنامے

08.05 : عادل شاہی کا ابتدائی عہد

08.06 : عادل شاہی کا درمیانی عہد

08.07 : عادل شاہی کا آخری عہد

08.08 : خلاصہ

08.09 : فرہنگ

08.10 : نمونہ امتحانی سوالات

08.11 : حوالہ جاتی کتب

08.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

08.01 اغراض ومقاصد

عادل شاہی دَور کا تعلق بیجاپور کے بادشاہوں سے ہے۔ عادل شاہی حکومت کا آغاز ۱۴۹۰ء میں ہوا اس خاندان میں کل آٹھ بادشاہ ہوئے یہ سب کے سب علم وادب کے اور فنونِ لطیفہ کے دل دادہ اور سرپرستی کرنے والے تھے۔ چناں چہ ان کے دَورِ حکومت میں فنونِ لطیفہ اور شعروادب کو خوب خوب فروغ ہوا۔ ان بادشاہوں نے علما، ادبا اور شعرا کی اس قدر سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی کہ عرب وعجم کے مختلف خطوں سے باکمال شخصیات نے بیجاپور کا رخ کیا۔ عادل شاہی حکمرانوں نے ان باکمالوں کو انعام واکرام سے نوازا۔ عادل شاہی عہد میں بیجاپور کو علوم وفنون اور تہذیب وتمدّن کا ایک اہم مرکز کہنا چاہیے۔ آج بھی بیجاپور میں شاہی محلات، خوب صورت گنبد ومساجد، مقبرے اور باغات بیجاپور کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اُردو زبان وادب کی ترقی میں سلاطینِ بیجاپور نے اہم رول ادا کیا ہے۔ عادل شاہی خاندان کے دوفرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ ثانی کی شاعری دکنی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔ نورس، ابراہیم نامہ، شہادت الحقیقت، خوش نامہ، نغزِ مرغوب، کلمتہ الحقائق اور ارشادنامہ وغیرہ عادل شاہی دَور کے ابتدائی ادبی کارنامے تصوّر کیے جاتے ہیں۔ خاص طور سے بیجاپور میں اُردو مثنوی کی ترقی اہم کارنامہ ہے۔

08.02 تمہید

عادل شاہی سلاطین کے پیش رو بہمنی سلاطین نے اُردو زبان وادب کے ارتقا کی بنیادیں رکھی تھیں لیکن ان کی خاطر خواہ ترویج وترقی قطب شاہی اور عادل شاہی دَور میں ہوئی۔ بہمنی سلاطین نے شمال کے مقابل جنوب میں جس انفرادیت وتشخص اور تہذیبی ولسانی روایات کی بنیاد ڈالی تھی، عادل شاہی سلاطین نے اس مقامی تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور طور طریقوں کو اہمیت دی تا کہ ارضِ دکن کی ایک علاحدہ سیاسی و تہذیبی پہچان بن سکے۔

عادل شاہی دَور کی دوسری صدی دکنی زبان وادب اور شعروسخن کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی دَور میں اصنافِ سخن کی باقاعدہ زُمرہ بندی ہوئی۔ مثنویوں کے علاوہ غزلیں اور قصائد بھی لکھے گئے اور شعروادب میں فکر واُسلوب کی سطح پر پختگی پیدا ہوئی۔ عادل شاہی دَور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ نے اپنی تصنیف نورس میں برج بھاشا اور دکنی دونوں زبانوں کا استعمال کیا۔

درباری شاعر عبدل کی مثنوی ابراہیم نامہ کو دہلوی اور دکنی دونوں زبانوں کا سنگم کہنا چاہیے۔ علی عادل شاہ کے دیوان میں قلی قطب شاہ کے دیوان کی طرح ہی سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

بیجاپور کے صوفیاے کرام نے بھی اُردو نثر ونظم کو اپنی تصانیف کے ذریعے مالا مال کیا۔ اُن میں خاص طور سے میراں جی شمس العشاق، اُن کے فرزندِ ارجمند برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ کو اہم مقام حاصل ہے۔

اُردو زبان وادب کے اوّلین کارناموں میں جن مثنویوں کو اولیت حاصل ہے ان میں عادل شاہی دَور کی مثنویاں چندر بدن ومہیار، کشف الوجود، کشف الانوار، بہرام وحسن بانو، فتح نامہ، میزبانی نامہ، قصّۂ بے نظیر، نجات نامہ، جنت سنگھار اور خاور نامہ خاص ہیں۔ رستمی کی مثنوی خاور نامہ کو اُردو کی سب سے ضخیم مثنوی کہنا چاہیے جو کہ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک رزمیہ مثنوی ہے۔

عادل شاہی دَور کے دوسرے ادبی کارناموں میں مثنوی علی نامہ، گلشن عشق، تاریخِ اسکندری، مثنوی یوسف وزلیخا، مثنوی قصص الانبیا، مثنوی اسرارِ عشق، گنجِ مخفی، شجر الاتقیا، نظم سہ حرفی، دیوان شاہ معظم اور روضۃ الشہدا کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔

عادل شاہی دَور میں رعایا کی خوش حالی اور امن وسکون کی وجہ سے دوسرے فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوّری، خطّاطی، نقّاشی اور تعمیرات وصنعت وحرفت کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔

08.03 عادل شاہی دَور کا تہذیبی وادبی پس منظر

کسی بھی خطے کا تہذیبی سرمایہ وہاں کی عمارتیں، رہن سہن، زبان وادب، میلے ٹھیلے، تہوار اور تمدّنی ترقی پر منحصر ہے۔ بیجاپور کے سلاطین نے اپنے ابتدائی دَورِ حکومت سے سلطنت کی زوال تک مذکورہ سبھی اُمور کا خیال رکھا۔ چناں چہ ان کے زمانے میں بے شمار خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ باوجود فارسی زبان کے ادیب وشاعر ہونے کے عادل شاہی سلطانوں نے اپنے محلات وتعمیرات اور بسائے گئے شہروں کا نام مقامی زبان وتہذیب سے لے کر رکھا۔ مثلاً نل درگ، پریہ محل، گگن محل، چمپا محل اور آنند محل، ابراہیم عادل شاہ ثانی جو اپنی علم وفضل کے بدولت عرب وعجم میں معروف تھا بجائے علامہ یا مولانا وغیرہ کے خطابات کے مقامی زبان کی اصطلاح ''جگت گرو'' کے نام سے جانا گیا۔

عادل شاہی دَور میں فنونِ لطیفہ کی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔خوش نویس،نقاش،کاتب،جلد ساز،موسیقی کار اور دیگر فنون کے ماہرین کی خاطر خواہ قدر دانی ہوئی۔ان کے عہدِ حکومت میں دیگر خطّوں کے علما و فضلا اور مؤرّخین کی قدر دانی کی گئی جس کی وجہ سے بڑے بڑے اور نام وَر مفکرّین اور مؤرّخین بیجاپور کی سلطنت میں آئے اور اپنے ادبی و تاریخی کارنامے پیش کیے۔ملاظہوری نے سہ نثرِ ظہوری،ابوالقاسم فرشتہ نے تاریخِ فرشتہ،ملا رفیع الدین شیرازی نے تذکرۃ الملوک کی تصنیف کی۔عادل شاہی حکمرانی میں رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال رکھا گیا۔اپنی سلطنت کی حدود میں بے شمار سرائیں،خانقاہیں،پل اور کوئیں اور باولیاں بنوائیں۔غرباء و مساکین کے لئے لنگر خانے بنوائے۔علما و مشائخ اور شعرا و ادبا کو انعام و وظائف سے نوازا۔

عادل شاہی سلطنت کے شہروں میں اور ان کے قلعوں کے دروازوں پر خبر گو اور واقعہ نویس ہمہ وقت موجود رہتے۔دیہاتوں کی دیکھ ریکھ اور ان کی جمع بندی سالانہ طور پر کی جاتی تھی۔بادشاہ کے کام کے اوقات مقرر تھے اور اس کو انساف پسند ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔مختلف تہواروں اور سال گرہ پر شہر کو آراستہ کر کے جشن منائے جاتے تھے۔عادل شاہی سلاطین کے دورِ حکومت میں ملک پر امن اور رعایا خوش حال تھی چناں چہ اسی وجہ سے ان کے عہد میں موسیقی،مصوّری،خطّاطی،نقّاشی اور دیگر صنعت و حرفت کے علاوہ زبان و ادب اور علوم و فنون کو ترقی ملی۔اُردو زبان و ادب کی نشو و نما اور ارتقا میں عادل شاہی دَور نے بے حد اہم کارنامے انجام دیے۔جن کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات میں کیا جائے گا۔

08.04 عادل شاہی دَور کے ادبی کارنامے

زوال پذیر بہمنی سلطنت کی پانچ ریاستیں تھیں ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے علاوہ باقی ریاستیں زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں چناں چہ ان ہی دو ریاستوں میں اُردو زبان کا خاطر خواہ فروغ ہوا۔عادل شاہی سلطنت تقریباً دوسو سال تک قائم رہی۔بیجاپور اس کا دارالسلطنت تھا۔عادل شاہی سلاطین اکثر صاحبِ علم اور بعض شاعری اور فنِ موسیقی میں دَست رَس رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے دربار میں بے شمار شاعروں،ادیبوں اور عالموں کو فیض حاصل ہوتا رہا۔یہاں کے ادبی کارناموں نے بیجاپور کو ایک دبستان کی حیثیت دِلا دی۔

دبستانِ بیجاپور کی اولین ادبی کاوشوں سید برہان الدین جانم کی منظومات کو شمار کیا جاتا ہے جو اپنے عہد کے ایک ممتاز صوفی بزرگ تھے۔نثری ادب میں ان کی کتاب کلمۃ الحقائق کو بالاتفاق دکنی نثر کا نقشِ اوّل کہنا چاہیے۔ارشاد نامہ ان کی طویل مثنوی ہے۔درباری شاعر کا شعری کارنامہ ''ابراہیم نامہ'' ہے۔جس میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کی معاشرتی زندگی کی ہو بہو عکاسی کی گئی ہے۔اس عہد کی ایک اہم مثنوی جو اپنے رمزیاتی اور ایمائی اُسلوب کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے وہ شاہ ابوالحسن قادری کی مثنوی ''سکھ انجن'' ہے۔

یوسف وزلیخا اور لیلیٰ مجنوں دکن کی قدیم مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔عادل شاہی دَور کے ایک معروف شاعر مقیمی کی مثنوی چندر بدن و ماہِ یار پہلی عشقیہ مثنوی شمار کی جاتی ہے۔جب کہ کمال خان رستمی کا خاور نامہ دبستانِ بیجاپور کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اسے رستمی نے ابنِ حسام کے فارسی خاور نامہ سے ترجمہ کیا جس پر ملکہ خدیجہ سلطان نے انعام کا اعلان کیا تھا اسے رستمی نے صرف ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔خاور نامہ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک ضخیم رزمیہ مثنوی ہے۔ان کے علاوہ صنعتی کی مثنوی قصّۂ بے نظیر کے علاوہ پھول بن،فتح نامہ نظام شاہ،میزبانی نامہ،گلشن عشق،علی نامہ،تاریخِ اسکندری وغیرہ عادل شاہی عہد کے معروف کارنامے ہیں۔

ان معروف مثنویوں کے علاوہ اُردو زبان کی دیگر اصناف ادب میں نصرتی اور علی عادل شاہ ثانی کے قصیدے فنی اعتبار سے اہم ہیں۔ جب کہ حسن شوقی، نصرتی، شاہی اور بحری کی غزلیں غزل کی فنی خوبیوں سے عاری نہیں۔ بعض شعرا نے مثنوی نگاری میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے۔ ان اصنافِ ادب کے علاوہ عادل شاہی عہد کے متعدد شعرا نے رباعی میں طبع آزمائی کی۔ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ عادل شاہی دَور کے اہم سلطان علی عادل شاہ ثانی جو شاہی تخلص رکھتے تھے انہوں نے موسیقی کے راگوں اور گیتوں پر مبنی کتاب ''کتاب نورس'' لکھی۔ یہی نہیں اُردو اصناف کے دیگر متروک صنفِ ادب برہنی، سہلا اور سہ حرفی کے نمونے جانم، اعلیٰ، شاہی، قادر اور معظم کے کلاموں میں ملتے ہیں۔ یہاں عادل شاہی عہد کے ادبی کارناموں کو تین ادوار میں تقسیم کر کے ان کی ادبی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

08.05 عادل شاہی: ابتدائی دَور

عادل شاہی عہد کے ابتدائی ایام میں میراں جی شمس العشاق کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ ایک صوفی شاعر تھے اور بہمنی سلطنت کے آخری دَور اور عادل شاہی عہد کے ابتدائی دَور میں بیجاپور میں موجود تھے۔ میراں جی ایام جوانی میں ہی دنیاوی تعلقات ترک کر کے راہِ خدا میں نکل گئے اور بیت اللہ میں قیام کے بعد کئی سال تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ میراں جی ایسے صوفی خاندان کے بانی تھے جس نے آگے چل کر صدیوں تک ارض دکن میں وحدانیت کی تبلیغ کی۔ چوں کہ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اس لئے ان کی تصانیف کا موضوع تصوّف اور اخلاقی تعلیم ہے۔ دکنی اُردو کے ابتدائی دور کی چار کتابوں کو ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

﴿۱﴾ خوش نامہ ﴿۲﴾ خوش نغز ﴿۳﴾ شہادت التحقیق

﴿۴﴾ نغز مرغوب..... یہ چاروں تصانیف نظموں پر مشتمل ہیں۔

اسی خانوادے کے ایک اور بزرگ شاہ برہان الدین جانم ہیں جو شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے متقی اور صوفی تھے۔ ہزارہا لوگوں نے اُن سے فیض پایا۔ دکنی زبان میں تصوّف اور حسنِ سلوک کے موضوع پر انہوں نے کئی رسالے تحریر فرمائے اصل میں ان کا یہ کارنامہ طریقت اور معرفت کی تعلیمات کو ان لوگوں تک پہنچانا تھا جو عربی و فارسی سے نابلد تھے۔ جانم نے متعدد نظموں کے علاوہ ذو معنی خیال کی مختلف راگ راگنیوں پر گیت لکھے۔ جسے دکن میں حقیقت گیت کہا جاتا ہے۔ دکنی ادب کی تاریخ میں جانم کی ادبی حیثیت مسلم ہے کیوں کہ انہوں نے پہلی بار نثر کو وسیلۂ اظہار کے لئے استعمال کیا۔ ان کی معروف تصانیف میں وصیت الہادی، بشارت الذّکر، سکھ سہیلا، منفعت الایمان، نسیم الکلام، حجت البقا اور ارشاد نامہ ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۰۷ھ میں ہوا اور اپنے والد کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ عادل شاہی دَور میں عام شعرا کے ساتھ ساتھ کئی سلاطین بھی ایسے ہوئے جنہوں نے اچھی شاعری کی اور اپنے بعد کئی تصانیف چھوڑی ہیں ان ہی سلطانوں میں ایک ابراہیم عادل شاہ ثانی بھی تھا جو علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا اور اس کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔ اس کا عہدِ حکومت ۱۵۸۰ء سے ۱۶۲۷ء تک ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کو اس کی علم و حکمت کی وجہ سے ''جگت گرو'' کہا جاتا ہے۔ وہ فارسی اور دکنی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ دَست یاب کلام میں فارسی کے اشعار اور دکن میں گیتوں کا مجموعہ کتابِ نورَس کے نام سے محفوظ ہے۔ کتاب نورس میں ایک مخصوص کتاب ہے جس میں متعدد معروف راگ راگنیوں سے متعلق الگ الگ گیت ترتیب دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ۱۹۵۵ء ابراہیم عادل شاہ ثانی کی اس تصنیف کو از سرِ نَو مرتب کر کے شائع کیا۔

جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے ایک معروف شاعر وابستہ تھا جس کا نام عبدل تھا لیکن نہ تو اس کا پورا نام معلوم ہوسکا اور نہ حالاتِ زندگی۔ اس کی تحریروں سے اور بعض الفاظ اور روزمرہ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دہلی سے تھا۔ یہ قرینِ قیاس ہے کہ اس کا خاندان دِلّی سے ترکِ وطن کر کے ارضِ دکن میں آباد ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابراہیم شاہ ثانی کی علم پروری اور فیّاضی سن کر وہ دِلّی سے اس کے دربار میں آیا ہو۔ حالات جو بھی رہے ہوں اس نے باضابطہ پہلا ادبی کارنامہ ابراہیم نامہ لکھ کر انجام دیا اس لئے کہ اس سے پہلے جو نظمیں لکھی گئیں یا نثری تصانیف موجود تھیں وہ پند و نصائح، مذہبی و صوفیانہ تھیں۔

ابراہیم نامہ کو دبستانِ بیجاپور کا پہلا باضابطہ ادبی کارنامہ کہنا چاہیے۔ ابراہیم نامہ مثنوی کی عام روایات کے مطابق مختلف عنوانات میں منقسم ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۷۰ اشعار پر مشتمل ہے جس میں عبدل نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی گھریلو اور نجی زندگی کے واقعات محفوظ کر دیے ہیں عبدل نے اس زمانے کے آدابِ دربار، رسم و رواج، عمارات، زیورات، سیر و شکار اور موسیقی کا بھرپور تذکرہ کیا ہے۔ یہ اصل میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شان میں لکھا گیا ایک قصیدہ ہے جو مثنوی کی ہیئت میں موجود ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے ۱۹۵۵ء میں اس مثنوی کو ترتیب دے کر شائع کیا۔

08.06 عادل شاہی: درمیانی دَور

عادل شاہی عہد کے درمیانی دَور میں اُردو زبان و ادب میں بہت سے شعراء و ادبا کا ذکر ملتا ہے جن کی تصانیف آگے چل کر ادبی و صنفی راہیں متعین کرتی ہیں۔ سلطان محمد عادل شاہ کا عہد معروف ادبی کارناموں کے لئے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عہد میں دبستانِ بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی چندر بدن و ماہِ یار لکھی گئی۔ یہ دکنی زبان میں لکھی گئی مشہور و معروف مثنویوں میں سے ایک ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۵۰ھ کے درمیان میں لکھی گئی۔ اس کا شاعر عادل شاہی دَور کا معروف و مشہور مقیمی ہے۔ مقیمی نے اس مثنوی میں ایک ہندو راجکماری چندر بدن اور ایک مسلمان تاجر زادہ محی الدین مہیار کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔

مقیمی کا دعویٰ ہے کہ اس مثنوی کی کہانی کسی اور کہانی کا چربہ نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی دکن میں اتنی مقبول ہوئی کہ مقیمی کے بعد متعدد شاعروں نے اسے اپنی مثنوی میں بیان کیا۔ حتیٰ کہ میر کی مثنوی کی ''دریائے عشق'' کا پلاٹ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اکبرالدین صدیقی نے اسے ازسرِ نو مرتب کر کے مجلس دکنی مخطوطات حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا۔

عادل شاہی عہد کے وسطی دَور کا ایک اور معروف شاعر صنعتی ہے۔ صنعتی کا پورا نام سید حسن شاہ محی الدین تھا۔ صنعتی کا تعلق مشہور صوفی بزرگ خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے تھا۔ صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں قصّۂ بےنظیر کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی۔ اس مثنوی میں اصل قصّہ سے قبل حمد، نعت، منقبت اور تعریفِ سخن کے علاوہ موجودہ سلطان محمد عادل شاہ کی تعریف بھی ہے۔ یہ مثنوی ایک ہزار چھ سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اسے عبدالقادر سروری نے ۱۹۳۸ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔ صنعتی کی ایک اور مثنوی گل دَستہ ہے جو ایک مصری شہزادہ کی فہم و فراست پر مشتمل قصّہ ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے ۲۰۰۳ء میں اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا۔

گولکنڈہ کی شہزادی خدیجہ سلطان کی شادی میں جہیز کے ساز و سامان کے ساتھ ایک حبشی غلام بھی دیا گیا تھا جس کا نام خوشنود تھا۔ بیجاپور میں ملک خوشنود نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ ملک خوشنود ایک اچھا شاعر اور بہتر منتظم و سیاست داں تھا۔ ۱۰۴۵ھ میں سلطان محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا۔ یہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ملک خوشنود نے دکن کی ایک معروف و مشہور

مثنوی ''جنت سنگار'' کے نام سے لکھی۔ یہ مثنوی سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ۱۰۵۶ھ میں لکھی گئی، ملک خوشنود کی دیگر ادبی کاوشوں میں قصائد، غزلیات، مرثیے اور ایک ہجو کے ساتھ ساتھ امیر خسرو کی فارسی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا دکنی ترجمہ بھی ہے۔ ملک خوشنود کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھا۔ اس نے اپنی تصنیفات میں متعدد جگہوں پر جدّت طرازی اور تازہ خیالی سے کام لیا ہے۔ اس کی مثنوی ''جنت سنگار'' کو پروفیسر سیدہ جعفر نے ۱۹۵۷ء میں جمع کر کے شائع کیا۔

دبستان بیجاپور کا ایک باکمال شاعر کمال خاں تھا جس کا تخلص رستمی تھا۔ رستمی کے والد ماجد کا نام اسمٰعیل خاں تھا جن کا خاندان چھ پشتوں سے بیجاپور کے شاہی دربار سے وابستہ تھا۔ رستمی سلطان محمد عادل شاہ کے دربار کا ''درباری شاعر'' تھا۔ اسے بیک وقت مثنوی، قصیدہ اور غزل جیسی معروف اصنافِ سخن پر کمال حاصل تھا۔ دکنی ادب کی تاریخ میں رستمی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے جس نے ابن حسام کی فارسی خاورنامہ کا فرمائشی ترجمہ کیا۔ اس کے عوض میں ملکہ خدیجہ سلطان کی طرف سے اسے انعام واکرام سے نوازا گیا۔ خاورنامہ اُردو کی طویل ترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اس میں ۲۲۲ عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ خاورنامہ کے ترجمے کی وجہ سے رستمی کو اُردو ادب کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا ترجمہ اس قدر دل کش اور رواں ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ رستمی کی اس طویل مثنوی کو شیخ چاند نے ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے ترقی اُردو بورڈ کراچی سے شائع کیا۔

احمد نگر کے نظام شاہی کے زوال کے بعد کافی ادبا و شعرا نے بیجاپور کا رُخ کیا۔ انہیں میں ایک قادرالکلام شاعر حسن شوقی بھی تھا۔ حسن شوقی کی ذہانت اور قادرالکلامی سے متاثر ہو کر موجودہ سلطان محمد عادل شاہ نے اس کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا۔ شوقی کو دکن کے تین درباروں نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سے وابستہ ہونے موقع ملا تھا۔ حسن شوقی کو مثنوی اور غزل دونوں اصناف پر دَست رَس حاصل تھی۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اس کی دو مثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میزبانی نامہ'' کے علاوہ ۲۱ غزلیں دَست یاب ہوئی ہیں۔ اسے رزم و بزم دونوں طرح کی پیش کش پر عبور حاصل تھا اور وہ موقع و محل کے لحاظ سے اُسلوب و لہجہ اختیار کرتا تھا۔ مثنوی فتح نامہ نظام شاہ اُردو کی قدیم مثنویوں کا بہترین نمونہ ہے جس میں اس زمانے کے رسم و رواج، عادات و اطوار، طور طریقے، مجلسی آداب، کھان پان، طرزِ لباس اور طرزِ رہائش کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس سے صدیوں پرانی مسلم تہذیب و معاشرت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

غزل میں حسن شوقی نے فارسی خیال و اسلوب اور صنعتوں کی پیروی کی ہے۔ ولی کی غزلوں کی روایت کا نقطۂ آغاز حسن شوقی کی غزلوں کو کہا جا سکتا ہے۔ حسن شوقی کے کلام کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے ''دیوان حسن شوقی'' کے نام سے ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) سے شائع کیا۔

08.07 عادل شاہی: آخری دَور

دبستانِ بیجاپور کو کئی نام وَر ادبا و شعرا عادل شاہی دور کے آخری عہد میں ملے جن میں نصرتی، شاہی، امین الدین اعلیٰ، مرزا، ہاشمی اور بحری کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ عادل شاہی سلطانوں میں کئی حکمران بذات خود شاعر و ادیب تھے۔ عادل شاہی سلطنت کا آٹھواں حکمراں سلطان علی عادل شاہ ثانی ان ہی میں سے ایک تھا۔ عادل شاہ ثانی شاہیؔ تخلص رکھتا تھا۔ اس کو شاعری اور ادب عالیہ کا ذوق اپنے دادا جگت گرو ابراہیم عادل شاہ سے ورثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جگت گرو کا پوتا ''استاد عالم'' کے نام سے سرفراز ہوا۔ اس کے دربار سے کئی معروف علما و فضلا و مؤرخین وابستہ تھے۔ جن میں نصرتی، سید نور اللہ، ابوالمعالی، عبدالنبی اور سید کلیم اللہ قابلِ ذکر ہیں۔

شاہی ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ دکنی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ تقریباً تمام صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ چناں چہ کلیات شاہی میں قصیدہ، مثنویاں، غزلیں، مخمس، مثمن، رباعیات، فردیات، گیت، کبت، دوہے، جھولنا اور تاریخی قطعات سبھی کچھ موجود ہیں۔ شاہی کا شمار دکن کے صف اوّل کے قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ شاہی کو موسیقی سے اتنا زیادہ لگاؤ تھا کہ اس نے گیتوں کے علاوہ کئی مرثیے بھی راگوں کے آہنگ میں لکھے اور انہیں پڑھنے کے لئے ان مرثیوں پر راگ کی نشان دہی کی ہے۔ شاہی کے بیش تر کلام میں بھرپور غنائیت پائی جاتی ہے۔ شاہی کے نامکمل نسخہ کو مولوی نصیرالدین ہاشمی نے دریافت کیا۔ ۱۹۶۲ء میں یہ شائع ہوا۔

سلطان علی شاہ ثانی شاہی کے دربار کا بڑا اور باکمال شاعر نصرتی تھا۔ پیشے سے نصرتی سپہ گری کرتا تھا۔ ایام جوانی میں وہ عادل شاہ ثانی کا مصاحب و دوست تھا۔ چناں چہ ثانی نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا۔ نصرتی اپنے علم و فضل میں بیجاپور کے چند باکمالوں میں شمار ہوتا ہے۔ لوگ اسے احترام سے مُلّا نصرتی کہہ کر پکارتے تھے۔ نصرتی کے عروج کی وجہ سے درباریوں کے حاسدوں نے ایک سازش کے ذریعہ اسے قتل کرادیا۔ نصرتی کی قبر نگینہ باغ بیجاپور میں واقع ہے۔ اس کے لوح مرقد پر 'نصرتی شہید اہے' کے الفاظ سے سن وفات ۱۰۸۵ھ نکلتا ہے۔ نصرتی نے تین معروف مثنویاں ''گلشن عشق، علی نامہ، تاریخِ اسکندری اور غزل وقصائد، رباعیات کا ایک دیوان اپنے پیچھے چھوڑا۔ گلشنِ عشق کا سن تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے جب کہ رزمیہ مثنوی علی نامہ کی سن تصنیف ۱۰۷۶ھ اور تاریخِ اسکندری کا سن تصنیف ۱۰۸۸ھ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کا دیوان مرتب کیا ہے۔ اس دیوان میں تاریخ اسکندری کے علاوہ قصائد، غزلیات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ نصرتی دکن کا باکمال مثنوی نگار تو تھا ہی قصیدہ گوئی میں بھی کوئی دکنی شاعر اس کا ہم پلہ نہیں۔ اس کے قصائد کو بلاشبہ فارسی کے قصائد کے برابر رکھ سکتے ہیں۔

دکن کے معروف صوفی بزرگ شاہ میراں جی شمس العشاق کے بارے میں آپ جان چکے ہیں سید شاہ امین الدین اعلیٰ ان کے پوتے تھے اور بیجاپور کے صوفیائے کرام میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ دکنی ادب کی تاریخ میں انہیں بہت احترام سے یاد کیا جاتا ہے انہوں نے رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کی خاندانی روایت کو جلا بخشی اور کئی منظوم اور نثری رسائل لکھے۔ ان کی منظومات میں رُموز السالکین، تربیہ، محبّ نامہ اور وجودیہ قابلِ ذکر ہیں اس کے علاوہ ریختہ غزلیں سُہلا اور راگ راگنیوں پر مبنی گیت بھی ان کی یادگار ہیں۔

انہوں ایک مدحیہ قصیدہ اپنے والد شاہ برہان الدّین کی مدح میں ''مدحِ شاہ برہان'' بھی لکھا ہے۔ شاہ امین الدّین اعلیٰ کی ایک طویل نظم ''گفتار امین اعلیٰ'' بھی ملتی ہے جس میں وحدت کے مسئلے پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کے نثری کارنامے میں ''گنجِ مخفی، وجودیہ، گفتار شاہ امین، ارشاداتِ ظاہر و باطن، عشق نامہ، شرح کلمۂ طیب اور کلمۃ الاسرار'' قابل ذکر ہیں۔ دکنی نثر کے آغاز و ارتقا میں شاہ امین الدین اعلیٰ کے ان کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔

عادل شاہ ثانی کے آخری دَور میں ایک اور صوفی شاعر محمد حسینی تھے۔ جو شاہ امین الدّین اعلیٰ کے خلیفہ قادر لنگا کوتال کے مرید تھے۔ شاعری میں انہیں ''شاہ معظم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شاہ معظم نے تقریباً سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام مثنوی، قصیدہ اور غزل کی ہیئت میں موجود ہے۔ شاہ معظم کی مثنویوں میں معراج نامہ، ساقی نامہ، مفتاح الاسرار، آزاد نامہ، گلزار چشت اور شجر الاتقیاء قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے غزلوں کا ایک دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ اس دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور ریختیاں بھی شامل ہیں۔ شاہ معظم کا ایک اور علمی کارنامہ ''سہ حرفی'' بھی مشہور ہے۔ جس میں الف سے واو لام تک سبھی تہجی حروف سے ایک ایک شعر کا آغاز کیا گیا ہے۔ نثر میں شاہ

معظم کا ایک مختصر رسالہ ''شرح شکار نامہ'' ہے جس میں گیسو دراز بندہ نواز کے فارسی شکار نامے کی شرح بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ابونصر ابوخالدی نے ان کا دیوان شائع کیا ہے۔

عادل شاہی عہد میں گو کہ مثنوی نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی گئی لیکن اس کے آخری دَور میں بڑے مرثیہ نگار بھی پیدا ہوئے۔ مرزا انہیں میں سے ایک بڑا مرثیہ نگار تھا جو علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔ اس نے صرف حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ لکھا۔ کسی بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھنے سے انکار کر دیا کرتا تھا۔ دکن میں مرثیہ گوئی کے آغاز وارتقا میں مرزا کے نام دو مرثیوں کا تذکرہ ملتا ہے ایک کا تعلق بیجاپور سے اور دوسرے کا گولکنڈہ سے تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مرزا کے نام سے موسوم دکنی مرثیوں میں سے کون سا مرثیہ بیجاپور کے مرزا کا ہے اور کون سا مرثیہ گولکنڈہ کے مرزا کا ہے۔ گو کہ مرزا کے مرثیے دکن میں مقبول عام تھے جن میں طویل اور مختصر دونوں طرح کے مرثیے ملتے ہیں۔ جو مسدّس میں اور غزل کی ساخت میں لکھے گئے ہیں۔

دبستان بیجاپور کا ایک اور شاعر ہاشمی بیجاپوری ہے۔ ہاشمی بیجاپوری کا پورا نام سید میراں میاں خاں ہاشمی تھا جو علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھا لیکن محققین نے عہدِ شباب میں چیچک کی بیماری سے اس کی بینائی ختم ہونے کی بات کہی ہے حقیقت جو بھی ہو یہ نابینا شاعر دبستانِ بیجاپور کے صفِ اوّل کا شاعر مانا جاتا ہے۔ شمس اللہ قادری نے ''اُردوئے قدیم'' میں ہاشمی بیجاپوری کا سنِ وفات ۱۱۰۹ھ بتایا ہے جو قرینِ قیاس ہے۔ ہاشمی بیجاپوری کی تصانیف میں غزلیات کے دیوان کے علاوہ مثنوی یوسف وزلیخا، مثنوی عشقیہ، معراج نامہ، مخمس وقصائد اور ہجو بھی شامل ہے۔ مثنوی یوسف وزلیخا ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے بعض محققین اس کے اشعار کی تعداد ۵۱۸۲/ بتائی ہے۔ ہاشمی ریختی کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے کیوں کہ اس نے اپنی غزلوں میں دکنی عورتوں کی گھریلو زبان، محاوروں اور کہاوتوں کے علاوہ عورتوں کے جذبات ان ہی کی زبان میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیے ہیں۔ اس کی غزلوں میں دکنی عورتوں کے زبان کا لب ولہجہ صاف صاف سنائی دیتا ہے۔ ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ۱۹۶۱ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔ جب کہ اس کی مثنویوں کو ڈاکٹر محمد علی اسد نے دکن کی تین مثنویوں کے نام سے مرتب کیا ہے۔

بیجاپور کے آخری عہد کے شعرا میں بحری کا نام قابل ذکر ہے۔ بحری کا اصل نام سید محمود تھا اور لقب وتخلص بحری تھا۔ ان کے والد محترم بحرالدین گوگی قاضی تھے اور قاضی دریا کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ۱۰۹۵ھ میں بیجاپور آئے جو عادل شاہی دَور کا آخری زمانہ تھا۔ بحری کے لئے ستم ظریفی کہی جائے گی کہ انہیں کسی ایک مقام پر تصنیف وتالیف کا موقع نہیں مل سکا۔ پہلے بیجاپور کو مغلوں نے اپنے قبضے میں لیا اور جب بحری وہاں سے نکل کر گولکنڈہ (حیدرآباد) پہنچا تو اگلے دو سال میں ہی مغلوں نے وہاں بھی قبضہ کر لیا۔ گولکنڈہ کے زوال کے بعد بحری مدراس چلے گئے اور ۱۱۰۰ھ میں وہ اپنے پیرومرشد کے آستانے میں گوشہ نشیں ہو گئے۔ بحری کی تین اہم تصانیف مثنوی ''من لگن، بنگاب نامہ اور دیوان غزلیات ہیں۔ دورانِ سفر رہزنوں نے بحری کے مال واسباب کے ساتھ ان کا ذخیرۂ سخن بھی لوٹ لیا جو تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ ''من لگن'' بحری کی سب مقبول مثنوی ہے جس کی سن تصنیف ۱۱۱۲ھ ہے۔ اس میں پینتالیس ابواب ۱۸۰۰/ سے زائد اشعار پر مشتمل ہیں۔ جب کہ دوسری مثنوی بنگاب نامہ میں بارہ بند ہیں جس میں تصوف وطریقت کا بیان ہے۔ قاضی محمود بحری نے طویل عمر پائی اور ۱۱۳۰ھ میں انتقال کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر حفیظ سید نے کلیات بحری مرتب کر کے شائع کروائی جس میں غزلوں کے علاوہ بنگاب نامہ بھی شامل ہے۔

08.08 خلاصہ

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ آزاد ریاستیں وجود میں آئیں جن میں ایک ریاست بیجاپور بھی تھی۔ بیجاپور کی ریاست پر عادل شاہی خاندان کی حکومت تا دیر قائم رہی۔ اس خاندان کے دو فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ ثانی جن کا تخلص شاہی تھا۔ انہوں نے دکنی میں بھی شاعری کی۔ ابراہیم عادل شاہ نے برج بھاشا اور دکنی میں گیت لکھے اور فن موسیقی پر ''نورس'' کے نام سے ایک تصنیف بھی اپنی یادگار چھوڑی۔ اس کے درباری شاعر عبدل کی مثنوی ''ابراہیم نامہ'' شمالی دکنی اُردو زبان کی اچھی مثال ہے۔ علی عادل شاہ کا دیوان شاعری کی تمام اصناف پر محیط ہے۔ دبستانِ بیجاپور میں بادشاہوں کے علاوہ صوفیائے کرام نے بھی اُردو نثر و نظم کو اپنی تصانیف سے مالا مال کیا۔ ان میں شمس العشاق میراں جی ان کے فرزند ارجمند برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ نے اُردو نظم و نثر دونوں میں اپنی تصانیف چھوڑی ہیں۔ شاہ میراں جی کی تصانیف دکنی میں لسانی کی اہمیت حامل ہیں۔ ان کی مثنوی ''شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، نغز مرغوب وغیرہ کے مخطوطے اب بھی کتب خانوں اور میوزیم کی زینت ہیں۔

برہان الدین جانم کی تصانیف میں ''کلمۃ الحقائق، سکھ سہیلا، ارشاد نامہ اور بشارت الذکر'' بطور خاص ہیں۔ شاہ امین الدین اعلیٰ نے کئی مثنویاں لکھیں ''گفتار شاہ امین، محبّ نامہ اور گنج مخفی و'' غیرہ ان کی اہم تصنیف ہیں۔ ان کے علاوہ عادل شاہی دَور کے عبدل کی مثنوی ''ابراہیم نامہ''، مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن وماہِ یار'' وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ ''کشف الوجود، کشف الانوار، بہرام وحسن بانو، فتح نامہ، میزبانی نامہ'' وغیرہ معروف مثنویاں ہیں۔ مثنوی ''قصہٴ بے نظیر اور گل دَستہ، مثنوی نجات نامہ، جنت سنگار، خاور نامہ'' وغیرہ ضخیم مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ نصرتی عادل شاہی دور میں ملک الشعرا تھا ان کی مثنوی ''علی نامہ، گلشنِ عشق اور تاریخ اسکندری'' بہت ہی معروف ہیں۔ ہاشمی کی مثنوی ''یوسف وزلیخا'' اور قدرتی کی مثنوی ''قصص الانبیاء'' مومن کی مثنوی ''اسرارِ عشق'' وغیرہ عادل شاہی دَور کی بے بہا خدمات ہیں۔

مثنویوں کے علاوہ عادل شاہی دور میں دیگر اصناف سخن میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے گئے جن میں علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کے قصیدے فنی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں تو حسن شوقی، نصرتی، شاہی اور بحری کی غزلیں اپنے اندر تغزّل کی ساری خوبیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اسی دَور میں دکنی کا سب سے بڑا مرثیہ نگار مرزا نے فن مرثیہ نگاری میں بے بہا خدمات انجام دیا حالاں کہ مرزا کے علاوہ عادل شاہی دَور کے متعدد شعرا نے مرثیہ لکھے لیکن کوئی بھی مرزا کی برابری نہ کر سکا۔ نصرتی، شاہی اور دیگر شعرا نے رباعی پر بھی طبع آزمائی کی۔

عادل شاہی دَور میں صنف نثر پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی۔ ''کلمۃ الحقائق'' نثری صنف کا پہلا نمونہ ہے جسے برہان الدین جانم نے ایک رسالے کے طور پر تحریر کیا۔ نثری خدمات میں ان کے وارثوں اور مریدین نے بھی نثری رسائل لکھ کر اپنے پیر و مرشد کی روایات کو آگے بڑھایا۔ کل ملا کر عادل شاہی دَور اپنے خوب صورت اور عالی شان محلات، فنونِ لطیفہ، ادبا، علما و فضلا کی قدر دانی و سرپرستی، فصیلیں، مسجدوں و مقبروں کے علاوہ اپنی بے بہا لسانی و ادبی خدمات کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

08.09 فرہنگ

آستانہ	:	چوکھٹ، دروازہ، بزرگوں کے مزار	صناعی	:	کاری گر، دستکار
بے بہا	:	بہت قیمتی	طبع آزمائی	:	طبیعت کی آزمائش، ذہانت کا امتحان
جدت طرازی	:	نیا پن	عاری	:	تنگ، قاصر، مجبور
رزمیہ	:	جنگی داستان یا نظم	عظمتِ رفتہ	:	ماضی کی شان وشوکت
رمزیاتی	:	اشارے کی باتیں	قدردانی	:	عزت کرنا، قدر کرنا
ریختہ	:	پڑا ہوا، بکھرا ہوا، ملی جلی زبان	مدعو کرنا	:	دعوت دینا، بلانا
زمرہ بندی	:	گروہ بندی، جماعت	مربی	:	سرپرست، پشت پناہ
سپہ گری	:	فوجی خدمات	مصاحب	:	ساتھی، خاص دوست
سرائے	:	مسافر خانہ	موسیقی	:	گانے بجانے کا علم، راگ کا علم

08.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : گلشن عشق کی فنی خوبیوں سے بحث کیجیے

سوال نمبر۲ : مثنوی نگار کی حیثیت سے نصرتی کا ادبی مقام متعین کیجیے؟

سوال نمبر۳ : عادل شاہی دَور کے صوفیائے کرام کی اُردو خدمات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : عادل شاہی دور کا تاریخی وتہذیبی پس منظر بیان کیجیے

سوال نمبر۲ : عادل شاہی عہد میں مثنوی نگاری کی ترویج وترقی کا خاکہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : دبستانِ بیجاپور کے اولین دور کے شعرا وادبا کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

08.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	از	پروفیسر احتشام حسین
۲۔ اُردو مثنوی کا ارتقا	از	عبدالقادر سروری
۳۔ تاریخ ادب اُردو جلد (اوّل)	از	ڈاکٹر جمیل جالبی
۴۔ تاریخ ادب اُردو ۱۷۰۰ء تک	از	پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین
۵۔ دکن میں اُردو	از	نصیرالدین ہاشمی

اکائی 09 : ولؔی اور سراؔج کا دَور

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : ولؔی اَورنگ آبادی

09.04 : قاضی محمود بحرؔی

09.05 : سید محمد فراقؔی

09.06 : داؤدؔ اَورنگ آبادی

09.07 : سراؔج اَورنگ آبادی

09.08 : شاہ قاسؔم اَورنگ آبادی

09.09 : عاجؔز اَورنگ آبادی

09.10 : وجدؔی کرنولی

09.11 : خلاصہ

09.12 : فرہنگ

09.13 : نمونۂ امتحانی سوالات

09.14 : حوالہ جاتی کتب

09.01 اغراض ومقاصد

اِس اکائی میں ولؔی اَورنگ آبادی اور سراؔج اَورنگ آبادی کے زمانے میں موجود اُردو زبان وادب کے دکنی شاعروں مثلاً قاضی محمود بحرؔی، سید محمد فراقؔی، داؤدؔ اَورنگ آبادی، شاہ قاسؔم اَورنگ آبادی، عاجؔز اَورنگ آبادی اور روجدؔی کرنولی وغیرہ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں کچھ معلومات پیش کی گئی ہیں تاکہ آپ اُن کی شاعری اور زندگی کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔ آخر میں پوری اکائی کا خلاصہ، مشکل الفاظ کے معانی، امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے، حوالہ جاتی کتب اور معروضی وغیر معروضی سوالات وجوابات بھی دیے گئے ہیں تاکہ آپ امتحان کی مشق بھی کرتے رہیں۔

09.02 تمہید

شہنشاہ اَورنگ زیب عالم گیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اورنگ زیب عالم گیر کی فتحِ دکن ایک تاریخی واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اُردو زبان وادب نے دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کی

سرپرستی میں ترقی کے جو مرحلے تیز رفتاری سے طے کیے تھے، اِن دو عظیم الشان سلطنتوں کی تباہی و بربادی نے اُس کی نشو ونما اور اِرتقا میں ایک بڑی رُکاوٹ ڈال دی۔

۸۷-۱۶۸۶ء کے واقعات اُردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں بڑے تباہ کن نتائج کے حامل ہیں۔ بہمنی عہد اور پھر اُس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی اَدوار میں اُردو زبان ترقی کر کے ایک علمی اور ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ خاص طور سے سترہویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ اور بیجاپور میں جو ادب وجود میں آیا، وہ شعر وادب کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ معیار کا حامل ہے لیکن اِن دو سلطنتوں کا زوال ایک ایسے انقلاب کی صورت میں رُونما ہوا جس نے سرزمینِ دکن کی تہذیب وتمدن اور علم وفن کی بنیادیں ہلا دیں۔ ۱۶۸۷ء کے بعد دکن کے شاعروں اور ادیبوں کا کوئی قدردان نہ تھا۔ مغل حکمران یا اہلِ شمال بڑی حد تک دکنی زبان سے ناواقف تھے۔ دوسری طرف وہ سلاطین یا اُمرا جنہوں نے ایک طویل عرصے تک دکن کے فن کاروں کی سرپرستی اور قدر اَفزائی کی تھی، وہ خود بے سہارا ہو گئے تھے۔ جہاں تک بیجاپور کا تعلق ہے، یہ شہر جنوبی ہند کا ایک عظیم ثقافتی اور تمدنی مرکز بن چکا تھا۔ ۱۶۸۶ء کے بعد ہمیشہ کے لئے گوشۂ گم نامی میں چلا گیا اور یہاں کے شعرا و اُدبا ایک ایک کر کے دُور دراز کے مقامات جیسے کڑپہ، کرنول، ویلور، آرکاٹ اور دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہو گئے لیکن گولکنڈہ کی صورتِ حال اِس سے مختلف تھی۔ ۱۶۸۷ء میں اَورنگ زیب عالم گیر نے گولکنڈہ کو فتح کرنے کے بعد اَورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ اِس لئے شعری، تمدنی اور ادبی ذوق کی وہ چنگاریاں جو خاکِ دکن میں موجود تھیں، اُن میں سے کچھ تو شعلہ بننے کی خاطر اَورنگ آباد پہنچ گئیں اور کچھ اِدھر اُدھر بکھری رہیں۔ اُس پُر آشوب زمانے میں بھی سرزمینِ دکن نے شاعروں ادیبوں اور فن کاروں کی پیداوار میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آنے دی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے اُردو شعر وادب کے اِرتقا کا پہیہ اِس قدر تیز رفتاری سے گھمایا تھا کہ ۱۶۸۷ء کے بعد بھی اُس کی رفتار کو بہ آسانی روکا نہ جا سکا۔ دکنی شاعری کی عظیم روایات فیروز، محمود، خیالی، محمد قلی، وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی، مقیمی، حسن شوقی، علی عادل شاہ، شاہی، نصرتی اور ہاشمی کی وساطت سے ولی اور سراج تک پہنچتی ہیں۔ اِن روایات کے اثرات نہ صرف ولی اور سراج کے معاصرین کی شاعری میں موجود ہیں بلکہ اِن کی بازگشت شمالی ہند کے دورِ اول کے شعرا کی شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔ اَورنگ زیب عالم گیر کی فتحِ دکن نے سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے ایک طرف شمال اور جنوب کو گھر آنگن بنا دیا تو دوسری طرف لسانی اور ادبی نقطۂ نظر سے ولی اور اُن کے معاصرین نے تدریجی طور پر فارسی زبان واَسالیب کے اثرات بھی قبول کیے اور اِس طرح اُردو شعر وادب گولکنڈہ اور بیجاپور کی حدود سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے پیروکار اور مداح صرف گجرات ودَکن ہی میں نہیں بلکہ کڑپہ، کرنول، ویلور اور آرکاٹ میں بھی نظر آتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ولی اور سراج کے دَور کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

09.03 ولی اَورنگ آبادی

شیخ ولی محمد، ولی اَورنگ آبادی اُردو کے ایک قدآور اور باکمال شاعر ہیں۔ ولی اَورنگ آبادی کے مقامِ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ولی اَورنگ آبادی نے آنے والے زمانے میں اُردو شاعری کے دَھارے کو موڑنے کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا، اُس کی وجہ سے اُردو زبان وادب کے کچھ محققین نے اُن کو اپنے صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ ولی کے بچپن کے واقعاتِ زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں اُنہوں نے کچھ عرصہ گجرات اور خاص طور سے احمد آباد میں قیام

کیا تھا۔ اِس واقعے کا ذکر اُن کے کلام میں ملتا ہے۔ شہرِ سورت کی تعریف میں ایک مثنوی بھی وَلیؔ اَورنگ آبادی کے دیوان میں موجود ہے۔ احمد آباد اور شہرِ سورت کے حوالوں کی وجہ سے گجرات کے بعض اہلِ علم نے اِس بات کا دعوی کیا ہے کہ وَلیؔ کا وطن گجرات ہے اور نو جوانی کے زمانے میں وہ اَورنگ آباد آئے اور یہیں رہائش اختیار کر لی۔ اِس کے برخلاف زمانۂ قدیم کے مؤرخین، محققین اور تذکرہ نگاروں سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک سب اِس بات پر متفق ہیں کہ وَلیؔ اَورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کا بچپن اِسی شہر میں گزرا۔ اگر چہ نو جوانی کے زمانے میں اُنہوں نے گجرات کا سفر کیا اور کچھ عرصے تک شاہ وجیہ الدین گجراتی کی خانقاہ میں قیام کیا۔

> وَلیؔ اَورنگ آبادی کے مقامِ پیدائش کے سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ''تاریخِ احمدی'' (مصنف مٹھن لال ۱۷۳۷ء) اور ''تحفۃ الکرام'' وغیرہ شہرِ احمد آباد کی ایسی تاریخی کتابیں ہیں جن میں وَلیؔ اَورنگ آبادی کا نام نہیں ملتا۔ وَلیؔ اَورنگ آبادی ایک جہاں گرد شاعر تھے۔ اُن کے شوقِ سیاحت کی شہادت کم و بیش تمام تذکرے دیتے ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف سید ابوالمعالی کے ساتھ دہلی کا سفر کیا تھا بلکہ جنوبی ہند کے کئی شہروں کی بھی سیاحت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے حج بھی کیا تھا اور زیارتِ مدینہ منورہ کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔''
>
> (وَلیؔ، نور الحسن ہاشمی، ص ر۱۳)

> ''احسنؔ مارہروی نے لکھا ہے کہ وَلیؔ ۱۰۷۹ھ میں اَورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے کتب خانۂ جامع مسجد، ممبئی کے دیوانِ وَلیؔ کے ایک مخطوطے میں درج قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنا کر وَلیؔ کی تاریخِ وفات ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء بتائی تھی جسے ایک زمانے تک مستند سمجھا جاتا رہا مگر حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولوی عبدالحق کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۲۰ء تک وَلیؔ کے باحیات رہنے اور ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء سے پہلے وفات پانے کی اطلاع دی ہے۔''
>
> (تاریخِ ادبِ اُردو، ج ر اول، ص ر ۵۷۷)

وَلیؔ اَورنگ آبادی کی شاعری کی فضا بنیادی طور پر دکنی ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف دکنی شاعری کی روایات کی پاس داری کی بلکہ دکن کے عظیم المرتبت شاعروں سے استفادہ کرتے ہوئے اُن زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں محمد قلی، غواصیؔ، حسن شوقیؔ، نصرتیؔ، شاہیؔ، شاہ سلطان اور دوسرے شاعروں نے دادِ سخن دی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

محمد قلی: خبر لیایا ہے ہُد ہُد میرے تئیں اُس یارِ جانی کا　خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا

وَلیؔ: الٰہی! رکھ مجھے تُو خاکِ پا اہلِ معانی کا　کہ کھلتا ہے اِسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

غواصیؔ: عاشق ہے جن تُج لال کا، اُس مال و دَھن سوں کیا غرض　ہے کام جس کوں روح سوں، اُس کوں بدن سوں کیا غرض

وَلیؔ: تجھ زلف کے بے تاب کوں، ملکِ ختن سوں کیا غرض　تُج لعل کے مشتاق کوں، کانِ یمن سوں کیا غرض

شاہیؔ: ساری رین، تیرا مدن، مُج طبع میں بھرپور ہے　تُج صبح مُکھ کے سامنے دیپک سدا مخمور ہے

ولی: تشنہ لب کوں تشنگی مے کی نہیں، ناسور ہے پنبہِ مینا اُسے جیوں مرہمِ کافور ہے

شاہ سلطان: صد سال وصلِ حق بن جیونا سو جیوں مگس ہے یک دم خدا تھے مل مل تل جیونا سو بس ہے

ولی: ہر دل رُبا کوں ں ہرگز دیتا نہیں ہوں دل مَیں دل بستگی کوں میری وہ بے مثال بس ہے

قدیم دکنی شعرا کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر ولی نے نہ صرف اُن کا اثر قبول کیا ہے بلکہ دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کا احترام بھی کیا ہے۔ ولی کے ابتدائی دور کی شاعری میں دکنی شاعری کے گہرے اثرات ہیں۔ ولی کے اُس دور کی شاعری کو محمد قلی، غواصی، شاہی، حسن شوقی اور شاہ سلطان وغیرہ کی شاعری کے ساتھ رکھا جائے تو ولی کی شاعری کو دکنی شعرا کی شاعری سے الگ کرنا دُشوار ہو جائے گا۔ اِس قسم کے چند اشعار دیکھیے:

سجن ہے سانولا سج کا، سجیلا کٹیلا ہور ہٹیلا لٹ پٹا ہے

ترا قد یو رشکِ قیامت اَچھو قیامت تلک یو سلامت اَچھو

تجھ دَر کی طرف سُندر آتا ہے ولی دائم مشتاق ہے دَرشن کا ٹُک درس دِکھاتی جا

ولی اَورنگ آبادی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری ہے۔ اُن کی غزلوں میں ہندوستانی تہذیب کی رُوح رچی بسی ہوئی ہے۔ تشبیہات، اِستعارات اور تلمیحات کے علاوہ اُن کے تخیل پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں نہ صرف ہندوستانی موسموں، پھلوں، پھولوں، باغوں، پرندوں، جانوروں، دریاؤں اور تہواروں وغیرہ کا ذکر کیا ہے بلکہ ہندوستانی ذوق کے تقاضوں کا احترام بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کوچۂ یار عین کاسی ہے جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم! تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوئے ہر دُوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی تِل نزک اُس کے جیوں سناسی ہے

جو دَھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم! ترکش میں تجھ نین کے ہیں اَرجن کے بان آج

قائم چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی اَورنگ آبادی نے ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند میں فارسی زبان کا سکہ چل رہا تھا۔ حکومتی زبان فارسی تھی۔ چوں کہ حکمرانوں کا رجحان فارسی زبان کی طرف زِیادہ تھا اور فارسی زبان ہی کی سرپرستی اور قدر دانی کی جارہی تھی، اِس لئے شاعروں اور اَدیبوں کا فارسی زبان کی طرف جھکاؤ ایک فطری بات تھی۔ ولی اَورنگ آبادی کے سفرِ دہلی سے پہلے بھی اگر چہ بعض شاعروں نے اُردو زبان میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی لیکن بنیادی طور پر اُن میں سے بیش تر شعرا فارسی زبان ہی کے شاعر تھے جو صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھار اُردو زبان میں بھی شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شمالی ہند کے فارسی آمیز ماحول میں جب ولی اَورنگ آبادی نے اُردو زبان میں غزلیں سنائیں تو اہلِ شمال کو اِس بات کا احساس ہوا کہ اُردو زبان جسے وہ ایک کم مایہ زبان سمجھتے تھے، اُس اُردو زبان میں بھی اتنی گہرائی و گیرائی اور قوتِ اظہار موجود ہے کہ اُس میں ایک معیاری اَدب کی پیداوار ممکن ہے۔

ولؔی اَورنگ آبادی ایک طرف دکنی زبان کی عظیم شعری روایات کے علم بَردار رَہے تو دوسری طرف اُن کے کلام میں سفرِ دہلی کے اَثرات بھی کارفرما رہے۔ ولؔی اَورنگ آبادی اُردو شاعری کے ایک ایسے دُوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف اُردوئے قدیم کی عظیم شاہ راہ اختتام کو پہنچتی ہے تو دوسری طرف شمالی ہند میں اُردو شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں ولؔی اَورنگ آبادی کی ملاقات اُس زمانے کے ایک مشہور عالمِ دین اور شاعر شیخ سعداللہ گلشن (وفات: ۱۱۴۱ھ مطابق ۱۷۲۸ء) سے ہوئی۔ شاہ گلشن نے ولؔی اَورنگ آبادی کی توجہ فارسی زبان کے موضوعاتِ شعر اور اسالیب کی طرف مبذول کرائی۔ اور اُنہیں اپنی شاعری کو فارسی شاعری کی روایات کے سرچشمے سے سیراب کرنے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ سفرِ دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا رنگ ولؔی اَورنگ آبادی کے تخلیقی شعور پر چڑھتا چلا گیا اور بہ قولِ مصحفی ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۱۹ء جب ولؔی اَورنگ آبادی کا دیوان دہلی پہنچا تو شمالی ہند کی فضا میں ولؔی اَورنگ آبادی کے شعری نغمے گونجنے لگے اور بچے بچے کی زبان پر اُن کے اشعار جاری ہو گئے۔

ولؔی اَورنگ آبادی زبان کے رمز شناس اور اصلاحِ زبان کے بہت بڑے محرک تھے۔ اُنہوں نے فارسی شاعری کے موضوعات، مضامین، تشبیہات، استعارات، روزمرے، محاورات، تراکیب اور ضرب الامثال وغیرہ سے بہ خوبی استفادہ کیا ہے۔ فارسی زبان کے بہت سے اشعار کا بڑی خوب صورتی اور فنی مہارت سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے اور اُردو زبان کے خزانے کو وسعت بخشی ہے۔ ولؔی اَورنگ آبادی کی چند تراکیب دیکھیے: ''شعلۂ آواز، دیدۂ حیراں، مسندِ گل، حُسنِ شور انگیز، شعاعِ آفتابی، رشکِ ماہِ کنعانی، خوبیِ اعجازِ حُسن، سلطنتِ ملکِ قناعت اور مطربِ نغمہ ساز'' وغیرہ۔

09.04 قاضی محمود بحرؔی

قاضی محمود بحرؔی کا شمار ولؔی اَورنگ آبادی کے ہم عصر شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اِن کا نام ''سید محمود'' تھا اور گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے رہنے والے تھے۔ اِن کے والد کا نام ''سید بحرالدین'' اور لقب ''قاضی دریا'' تھا۔ اِن کا خانوادہ ''سبز پوش قادری'' کے نام سے مشہور تھا۔ بحرؔی ۱۰۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۱۳۰ھ میں ۱۰۸ر سال کی عمر میں وفات پائی۔ قاضی محمود بحرؔی کو سلسلۂ قادریہ اور چشتیہ دونوں میں بیعت حاصل تھی۔ قادریہ سلسلے میں شاہ محمد باقر سے بیعت تھے جن کی مدح میں انہوں نے اپنی مثنوی ''من لگن'' میں ایک باب خاص کیا ہے جب کہ چشتیہ سلسلے میں اپنے والد سید بحرالدین سے ارادت و اجازت رکھتے تھے جنہیں خانوادۂ شاہ برہان الدین جانم میں بیعت حاصل تھی۔

> ''بحرؔی ایک پُر گو شاعر تھے۔ اُن کی قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۷ء میں جب اُن کی عمر ۷۵ر سال تھی، اُس وقت تک اُردو اور فارسی زبان میں پچاس ہزار اشعار کہہ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ گوگی سے ترکِ وطن کر کے بیجاپور میں مقیم تھے۔ اَورنگ زیب کی فوجوں نے جب بیجاپور پر قبضہ کیا تو بحرؔی نے ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۷ء میں حیدرآباد کا رُخ کیا۔ دورانِ سفر ڈاکوؤں نے نہ صرف اُن کا مال و اسباب لوٹ لیا بلکہ سرمایۂ خون بھی ضائع کر دیا۔ بحرؔی نے حیدرآباد میں تقریباً دو سال تک قیام کیا اور جب حیدرآباد بھی اورنگ زیب عالم گیر کی قلم رَو میں شامل ہو گیا تو وہاں سے مدراس چلے گئے اور ۱۱۰۰ء میں اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد باقر کے آستانے میں گوشہ گیر ہو گئے۔''
>
> (مثنوی من لگن، سخاوت مرزا، ص ۳۲ر)

بحرؔی نے ایک دیوان اور دو مثنویاں ''بنگاب نامہ'' اور ''من لگن'' اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اِن کے علاوہ اُن کی چند منظومات کا بھی پتا چلتا ہے جنہیں ڈاکٹر حفیظ سید نے مرتب کر کے کلیاتِ بحری میں یکجا کر دیا ہے۔ جہاں تک بحرؔی کے دیوان کا تعلق ہے، اُس میں ایک سو تیرہ ۱۱۳/غزلیں شامل ہیں۔ بحرؔی کی مثنویوں میں متصوفانہ رنگ غالب ہے جن کے مطالعے سے وہ ایک عارفِ کامل کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اُس کے برعکس اُن کی غزلوں میں عشقِ مجازی کی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ اُن کے خیال میں مکتبِ مجازی میں عشق کے آگے زانوئے اَدب تہ کرنے سے عشقِ حقیقی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں:

مُنجہ اِس مکتب مجازی میں جو عشق اُستاد نہ ہوتا — تو میرے دل سوں کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا
بحرؔ یا سر پاؤں کیوں کرتا حقیقت کا سو بول — گرنا کھڑتا سر پہ تیرے یو مجازی مار کا (معرکہ)

بحرؔی کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جن میں روحانی کیفیات کی عکاسی یا عشقِ حقیقی کا بیان ہو۔ اُن کی بیش تر غزلوں میں محبوب کے حُسن و جمال، خدوخال، رفتار و گفتار، چشم و اَبرو اور لب و رخسار کی تعریف و توصیف ملتی ہے:

دیکھ تیرے اُور رُخ رنگیلے لال — پھول ہوتے ہیں پھول کھل خوش حال
جے مُکھ ہے آفتاب اُجالا سو اُو ترا — مستک پُنم کے چاند سُوں ہالا سو اُو ترا
جانے دیا نہ دھن لک، اُس ہٹ نہ کیں تو کیا کیں — ایسے رقیب اُوپر پھٹ پھٹ نہ کیں تو کیا کیں

آخر الذکر شعر کی زمین میں ولؔی اَورنگ آبادی نے بھی غزل کہی ہے:

دلبرا دھر کوں تیرے کوثر نہ کوں تو کیا کوں — میٹھے ترے لباں کوں شکر نہ کوں تو کیا کوں

ڈاکٹر جمیل جالبی، بحرؔی کی غزل گوئی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بحرؔی کی غزلیں اُسی روایت کی ترجمانی کر رہی ہیں جس پر شروع میں ولؔی چلے تھے۔ اگر بحرؔی کی غزلوں کو ولؔی کے ابتدائی دَور کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچاننا مشکل ہوگا۔ اِس لئے بحرؔی کی چند غزلیں ولؔی سے بھی منسوب ہوگئی ہیں۔''

(تاریخِ ادبِ اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ج/۱، ص/۵۲۲)

مثنوی ''بنگاب نامہ'' ۱۴۴/ابیات پر مشتمل ہے جسے بحرؔی نے ۱۲/ بندوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر بند میں ۱۲/ابیات ہیں جنہیں بحرؔی نے ''جام'' کا نام دیا ہے اور ہر جام میں بنگ (بھنگ) یعنی شراب کی تعریف اِس انداز میں کی گئی ہے کہ اُس سے تصوف و معرفت کے اسرار کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔

تصوف و عرفان کے موضوع پر بحرؔی کی سب سے مشہور مثنوی ''من لگن'' ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۱۲ء کی تصنیف ہے جب بحرؔی کی عمر ۹۰/ سال تھی۔ ۱۸۳۰/اشعار اور ۴۵/ابواب پر مشتمل اِس ضخیم مثنوی کو مولوی سخاوت مرزا نے ۱۹۵۵ء میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مثنوی من لگن کا آغاز حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اُس کے بعد کے ابواب میں توحیدِ باری، نعتِ رسولِ مقبول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)، بیانِ معراج،

مدحِ خلفائے اَربعہ، منقبتِ پیرومرشد (شیخ محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ)، توصیفِ بادشاہ اَورنگ زیب عالم گیر، سببِ تصنیف اور شکایتِ روزگار وغیرہ کا بیان ہے۔ تمام ابواب کو بحرؔی نے فارسی عنوانات سے آراستہ کیا ہے۔ آخری باب کا عنوان ''خاتمہ'' ہے۔ دیگر ۳۵/ درمیانی ابواب میں مختلف متصوفانہ مسائل جیسے طلبِ حق، فضیلتِ انسان، کیفیتِ موجودات، روحِ مطلق اِسرارِ دل ونفس، اَسرارِ بےخودی، سُرود وسماع اور عشق وغیرہ زیرِ بحث آئے ہیں۔ بحرؔی نے سلوک ومعرفت کے مختلف مسائل کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں تشبیہ واستعارہ اور تمثیل وحکایت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

مثنوی من لگن کی مقبولیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے مشکل الفاظ کی ایک شرح سید شاہ اسمٰعیل قادری نے نواب شہامت جاہ بہادر کی فرمائش پر ''ارت من لگن'' کے عنوان سے لکھی۔ خود بحرؔی نے بھی ۱۱۱۶ء میں اپنے معتقدوں اور مریدوں کے اصرار پر اُس کے بعض اہم موضوعات کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اُس کا نام ''عروس العرفان'' رکھا۔

بحری کی زبان بنیادی طور پر ''بیجاپوری دکنی'' ہے لیکن انہوں نے اپنی زبان کو ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

> ''بحرؔی دکن کے اُن شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے سرپرست سلاطینِ قطبیہ وعادل شاہیہ کے زوال کے بعد بھی اپنے قدیم ذوقِ شعروسخن کو جملہ لوازمات کے ساتھ عرصۂ دراز تک باقی رکھا۔''
>
> (تذکرۂ اُردو مخطوطات، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، ج/ا، ص/۵۶)

بحرؔی کی غزلوں میں کہیں کہیں ولؔی کی تحریکِ اصلاحِ زبان کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

09.05 سید محمد فراقؔی

سید محمد فراقؔی دکن کے اُن خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ شمالی ہند کے متعدد تذکروں جیسے ''تذکرہ شعرائے اُردو، میر حسنؔ، مخزنِ نکات، قائمؔ چاند پوری اور مجموعۂ نغز، قدرت اللہ قاسمؔ'' وغیرہ میں اُن کا ذکر ملتا ہے۔ قائمؔ چاند پوری نے اپنے تذکرے مخزنِ نکات میں لکھا ہے کہ فراقؔی نے محمد یار خاں صوبہ دارِ دہلی کے زمانے (۱۱۰۸ھ، ۱۱۱۴ھ) میں دہلی کا سفر کیا تھا۔''

(مخزنِ نکات، قائمؔ چاند پوری، ص/۷)

''مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ اَورنگ زیب عالم گیر کی فتحِ دکن کے بعد فراقؔی نے کچھ عرصے تک اَورنگ آباد میں قیام کیا اور پھر جنوبی ہند پہنچ کر ویلور میں سکونت اختیار کر لی۔ (دکن میں اُردو، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ص/۳۷۵) ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا بیان ہے کہ فراقؔی نے فقیر اللہ آزؔاد اور ولؔی کے ساتھ اَورنگ آباد سے نکل کر سورت، احمد آباد اور دلی کا سفر کیا۔''

(تذکرۂ اُردو مخطوطات، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، ج/۴، ص/۲۷۲)

ولی اورنگ آبادی کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے فراقی کے ایک مصرع پر گرہ لگائی تھی:

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھا تا آستیں آوے

ولی اورنگ آبادی نے جہاں اپنے کلام میں اپنے متعدد بے تکلف احباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اپنے شاعرانہ مرتبے کا فراقی سے تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی! کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

فراقی کی ایک ضخیم مثنوی ''مرآۃ الحشر'' کے علاوہ اُس کی دو نعتیں، چند غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دَست یاب ہوئے ہیں۔ ''مرآۃ الحشر'' تقریباً چار ہزار ابیات پر مشتمل ایک غیر مطبوعہ مثنوی ہے جس کے مطالعے سے مثنوی کی تاریخِ تصنیف، فراقی کے نام، تخلص اور فراقی کی تاریخِ پیدائش پر روشنی پڑتی ہے:

فراقی تخلص ہے میرا مدام ولے اصل سید محمد ہے نام

کیا قصد تاریخ جب بولنا یو اجمال تفصیل کر کھولنا

تو مجھ دل کیا اِس وزا اِنتخاب یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب

۱۱۳۲ھ

فراقی نے یہ مثنوی ۱۱۳۲ھ میں ۳۶ رسال کی عمر میں لکھی۔ اِس مثنوی سے فراقی کی تاریخِ پیدائش ۱۰۹۷ھ برآمد ہوتی ہے۔

''مرآۃ الحشر'' میں احوالِ قیامت بیان کیے گئے ہیں اور فراقی نے فارسی مثنوی ''آخرت نامہ'' کو دکنی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اِس مثنوی میں نزع کی کیفیت، اہلِ قبور کا بیان، یومِ حشر، قیامت کی علامتیں، دجال، یاجوج ماجوج کی فتنہ انگیزی، ظہورِ حضرت امام مہدی علیہ السلام، ظہورِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، پل صراط اور جزا و سزا کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اِس مثنوی کے علاوہ فراقی کی چند غزلوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں مدحتِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)، عشق و محبت، فلسفہ و تصوف، درویشی و گوشہ نشینی اور قناعت پسندی وغیرہ کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا

فقیراں باوجودِ دَست و پا بے دَست و پا اَچھنا اُنوں سب کی نظر میں، اُن کی نظراں میں خدا اَچھنا

میں جاں اَچھوں مجھ دل کوں شوق اُس گل بدن کا کھینچتا بلبل کے دل کو دام بھار شتہ چمن کا کھینچتا

مجے اے حُسن کا ساقی! لباں کائے پلاتا نئیں اَرے ظالم! مَیں مَرتا ہوں تجے کُچھ رحم آتا نئیں

فراقی کی زبان اور موضوعاتِ شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فراقی کی شاعری کی زبان ولی اورنگ آبادی کے دورِ اول کی شاعری کی زبان سے مزاجاً قریب ہے۔ فراقی کی غزلوں میں دو قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ ایک عشقیہ موضوع ہے جس میں جذباتِ عشق، خواہشِ وصل، ہجر کی تڑپ اور محبوب کی ہر اَدا پر جان و دل سے فریفتہ ہونے کا اظہار ملتا ہے اور دوسرا ناصحانہ

موضوع ہے جس میں قناعت پر زور، ہوس وطمع سے نفرت، دشمن کو معاف کر دینے کی تلقین، درویشی، نیکی اور گوشہ نشینی وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔''

(تاریخِ ادبِ اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ج ۱/ص ۵۶۰)

09.06 داؔؤد اورنگ آبادی

نام ''مرزا داؤد بیگ اور تخلص ''داؔؤد'' تھا۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ''مرزا سلیمان'' تھا۔ داؔؤد اورنگ آبادی کے آباو اَجداد عہدِ عالم گیر میں بلخ سے اورنگ آباد آئے اور یہاں منصبِ بادشاہی سے معزز ومکرم ہوئے۔ داؔؤد اورنگ آبادی کی تاریخِ پیدائش پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ داؔؤد اورنگ آبادی کو سراؔج اورنگ آبادی کا مدِ مقابل سمجھا جاتا تھا۔ سراؔج اورنگ آبادی سے اُن کی شاعرانہ چشمک بھی رہی ہے اور داؔؤد اورنگ آبادی نے اپنے کلام میں خود کو ''ولی ثانی'' کہا ہے۔ اِس لحاظ سے وہ غالباً سراؔج اورنگ آبادی (پیدائش ۱۱۲۴ھ) سے عمر میں بڑے رہے ہوں گے۔ اپنی خدا داد صلاحیتوں کی وجہ سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور فنِ شاعری میں انہوں نے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔

مجھ کو کچھ علم نہیں ہے، وہ خدا آپ علیم شعر کہنا مجھے داؔؤد خدا داد آیا

داؔؤد اورنگ آبادی کے معاصرین میں یوں تو متعدد شعرا دادِ سخن دے رہے تھے لیکن وہ سراؔج اورنگ آبادی کے سوا کسی اور کو اپنا مدِ مقابل نہیں سمجھتے تھے۔ اگر چہ داؔؤد اورنگ آبادی شاعرانہ کمال کے لحاظ سے سراؔج اورنگ آبادی کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن غالباً بہ لحاظِ عمر اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ سراؔج اورنگ آبادی پر چوٹ کی ہے۔

جب سوں روشن ہے مجھ سخن کا چراغ رشک سیتیں سراؔج جلتا ہے

چرب زبانی نہ کر بزمِ سخن میں سراؔج! تیغ سیں گل گیر کی ورنہ کٹے گا سَر آج

داؔؤد اورنگ آبادی ''فنِ کار چوبی'' کے ماہر تھے۔ اِسی رعایت سے سراؔج اورنگ آبادی نے بھی درجِ ذیل شعر میں اُن پر چوٹ کی ہے۔

نہ بھول کسبِ قدیمی کو اپنے اے مرزا! وگرنہ بچہ کہیں کار چوب ہووے گا

داؔؤد اورنگ آبادی کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ انہوں نے ولؔی اورنگ آبادی کے کلام سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ وہ کھلے دل سے ولؔی اورنگ آبادی کی شاعری کے گن گاتے ہیں اور ولؔی اورنگ آبادی کی پیروی کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اپنے کئی اشعار میں انہوں نے خود کو ''ولی ثانی'' اور ''ولی کا مقلد'' کہا ہے:

علی کی ہے قسم سن شعر میرا کہے عالم ''ولی ثانی'' یہی ہے

بعد از ولؔی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن داؔؤد! شعر تیرا مشہور ہے دَکن میں

حق نے بعد از ولؔی مجھے داؔؤد! صوبۂ شاعری بحال کیا

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اِس شعر کوں سن کر تجھ طبع میں داؔؤد! ولؔی کا اَثر آیا

داؤدؔ اورنگ آبادی نے ولیؔ اورنگ آبادی کی زمین میں بے شمار غزلیں کہی ہیں اور بعض غزلوں میں ولیؔ اورنگ آبادی کے مصرعوں پر گرہیں بھی لگائی ہیں:

پڑھو ناصح! انگے مصرع ولیؔ کا نصیحت عاشقاں کوں کب رَوا ہے
ہوا معلوم مصرع سوں ولیؔ کے پری رخسار سوں ملنا ہنر ہے
راست اے داؤدؔ! کہتا ہے ولیؔ عشق میں صبر و رضا دَرکار ہے

داؤدؔ اورنگ آبادی کے دیوان کا بیش تر حصہ محبوب کے خدوخال، لب و رخسار، چشم و اَبرو اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے۔ یہی اُن کی شاعری کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور اِنہی میں اُن کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں:

زلف تیری دامِ عالم گیر ہے مجہ دلِ وحشی کے تئیں زنجیر ہے
اے کماں اَبروِ تری ہر یک پلک مارنے عاشق کوں کاری تیر ہے
جس نے وہ گل بدن نہیں دیکھا اُس نے سیرِ چمن نہیں دیکھا
خیال اُس چشم کا ہے جب سیں دل میں سدا وحشت میں ہوں مانندِ آہو

داؤدؔ اورنگ آبادی نے صنعتِ ایہام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے دیوان کے آخر میں ''فردیاتِ ایہام'' کے عنوان سے ۲۹/اشعار موجود ہیں:

عالم میں معتبر ہے اکثر سخن اُسی کا مثلِ قلم جہاں میں جو دو زباں ہوا ہے
آباد کیوں نہ یادِ علی میں رہوں سدا روزِ ازل سو دل ہے مرا مرتضیٰ نگر
ہے شباب و کباب و فصلِ بہار کوئی اِس وقت جو پیا لا دے

لیکن یہ داؤدؔ اورنگ آبادی کا خاص رنگ نہیں ہے بلکہ یہ صرف اُس دور کے رجحان کا اثر ہے۔ داؤدؔ اورنگ آبادی کے یہاں ولیؔ اورنگ آبادی کے دورِ اول کی شاعری کی طرح دکنی رنگ بھی موجود ہے اور دورِ دوم کی شاعری کی طرح فارسی شاعری کے رجحانات سے اَثر پذیری کے نتیجے میں تراکیب اور اضافتوں کی کثرت بھی ہے۔ داؤدؔ اورنگ آبادی کی چند اضافتیں اور ترکیبیں دیکھیے:

''شوقِ بوئے غنچۂ گل، آئینۂ دل، دیدۂ پُرخوں، مثلِ صورتِ دیوار، سینۂ تحریرِ حباب، بوئے غبارِ راہ، بادۂ گل رنگ، چہرۂ دل دار، خیالِ رُوئے روشنِ یار، سایۂ معشوقِ ہرجائی'' وغیرہ

فراقیؔ اور بحریؔ کے مقابلے میں داؤدؔ اورنگ آبادی کی زبان بہت صاف ہے۔ اُن کے کام میں ولیؔ اورنگ آبادی کے ابتدائی دور کی شاعری کی طرح جگہ جگہ قدیم دکنی الفاظ جیسے ''سوں، کوں، سیتے، کیتی، منے، سجن، سریجن، پیو، موہن، تجہ لب، مجہ دل، نمن، انجھو، اچھنا، کاں، نیں، باج، انگے، یو، اپس'' وغیرہ بہ کثرت نظر آتے ہیں جنہیں کچھ تبدیلی کے ساتھ بہ آسانی آج کی زبان کی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

09.07 سراجؔ اَورنگ آبادی

سید سراج الدین سراجؔ اَورنگ آبادی (ولادت ۱۱۲۸ھ مطابق ۱۷۵۱ء، وفات ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء) اُس پر عظمت اَدبی وَراثت اور شعری روایت کے آخری علم بَرداروں میں شمار ہوتے ہیں جو کم وبیش تین صدیوں تک دکن کے مختلف ادبی مراکز جیسے گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، بیجاپور اور پھر اَورنگ آباد میں نشو ونما پا رہی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ سے ولیؔ اَورنگ آبادی تک یہ ادبی روایت اپنی نشو ونما اور اِرتقا کی نئی منزلیں طے کرتی رہی۔ سراجؔ اَورنگ آبادی کے بعد دکنی شاعری کی روایات میں بہ تدریج دھیما پن آتا گیا اور اُس کی جگہ فارسی شاعری کے اَثرات نے لے لی۔ ولیؔ اور سراجؔ نے دکنی شاعری کی اِس عظیم روایت کا سلسلہ شمالی ہند کی شاعری سے ملایا جس کی وجہ سے ۱۷۵۰ء کے بعد شمالی ہند میں فارسی شاعری کے زیرِ اثر نئے خطوط پر اردو شاعری کا آغاز ہوا۔

سراجؔ اَورنگ آبادی نے ۱۲/سال کی عمر میں علومِ متداولہ کی تعلیم مکمل کر لی۔ اُس زمانے میں اُن پر جذب ومستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی اور بے اختیار فارسی اشعار اُن کے منہ سے جاری ہو جاتے تھے۔ کبھی بے خودی کے عالم میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ رات دن صحرانوردی کرتے تھے اور زیادہ تر وقت حضرت شہاب الدین غریبؔ کے آستانے پر گزارتے تھے۔

۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں جب سراجؔ کی عمر ۱۹/ یا ۲۰/سال تھی، انہوں نے چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت کی۔ اُس زمانے میں انہوں نے اردو شاعری کا آغاز کیا اور ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں اپنے مرشد کے حکم پر شاعری چھوڑ دی۔

سراجؔ اَورنگ آبادی نے پانچ، چھ سال کی مختصر مدت میں اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔ انہوں نے کم وبیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند وغیرہ تمام اصنافِ شعر ملتے ہیں۔ عشق اُن کی شاعری کا بنیادی محور ہے۔ جذبۂ عشق اور سوزِ محبت کی وجہ سے اُن کی شاعری اور شخصیت میں وسیع المشربی، خاکساری اور بے نیازی کی کیفیات پیدا ہوگئی ہیں۔ سراجؔ نے یوں تو چھوٹی بڑی ۱۲/مثنویاں تصنیف کی ہیں لیکن ''بوستانِ خیال'' اُن کی سب سے طویل عشقیہ مثنوی ہے جو نہ صرف عہدِ ولیؔ اور سراجؔ کی ایک نمائندہ مثنوی ہے بلکہ اُردو کی بلند پایہ مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ ''بوستانِ خیال'' اُس کا تاریخی نام ہے جس سے نہ صرف اُس کی تاریخِ تصنیف ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء کا پتا چلتا ہے بلکہ تعدادِ اشعار (۱۱۶۰) پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کیا مَیں جب اِس مثنوی کا خیال — تھے ہجری ہزار اَور صد شصت سال
شمار اِس کی اَبیات کا جب کیا — تو ہجری کے سَن سے موافق ہوا
زِبس اِس میں ہے سیرِ گلشن تمام — رکھا بوستانِ خیال اِس کا نام
عدد جب کہ اِس نام کے آئے ہات — مطابق ہوئے سال واَبیات سات

اِس مثنوی کے درجِ ذیل شعر میں سراجؔ نے یہ اطلاع دی ہے کہ یہ طویل مثنوی انہوں نے صرف دو دن میں لکھی ہے:

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسبِ حال — زباں پر نکل آیا دل کا اُبال

بوستانِ خیال کا قصہ اُس عہد کی دیگر مثنویوں کی طرح کسی فرضی یا خیالی داستان پر مبنی نہیں ہے بلکہ اِس میں سراجؔ نے اپنے ذاتی حالات وواقعات کی ترجمانی کی ہے۔ سراجؔ ایک خوب رُو نوجوان پر فدا ہو گئے تھے جو اُن کے یہاں درس وتدریس کے سلسلے میں آیا کرتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اُس نوجوان نے اچانک سراجؔ سے ترکِ تعلق کرلیا جس کی وجہ سے وہ بے چین و بے قرار رہنے لگے۔ ایک سردار زادے کے کہنے پر سراجؔ نے اپنی رُودادِ عشق اُس کو سنائی۔ اِس مثنوی کا اختتام مناجات پر ہوتا ہے جس میں انہوں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اُن کا دل بتوں کی محبت سے آزاد ہو جائے۔ وہ صحبتِ غیر سے کنارہ کشی اختیار کر کے دَیر سے کعبے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اِس طرح بوستانِ خیال عشقِ مجازی سے شروع ہو کر عشقِ حقیقی پر ختم ہوتی ہے۔ سراجؔ کی دیگر مثنویاں مختصر ہیں جن کی حیثیت مثنوی سے زیادہ مسلسل غزل کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالی کے بہ قول:

''یہ نظمیں اِس معنٰی میں مثنویاں ہیں کہ اِن میں مثنوی کی بحر کی پابندی اور اَبیات کا التزام کیا گیا ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے یہ نظم اور غزلِ مسلسل کی ملی جلی شکلیں ہیں۔''

(تاریخِ ادبِ اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ج/۱، ص/۵۸۱)

جہاں تک سراجؔ کی غزل گوئی کا تعلق ہے تو وہ ولؔی کے بعد اور عہدِ میرؔ و سوداؔ سے پہلے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غزل گوئی کے میدان میں اُن کا کوئی ہم عصر اُن کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ سراجؔ کی غزل گوئی کا نمایاں وصف سادگیِ بیان، سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔ اُن کی غزلوں میں بڑا کیف ہے، وارفتگی ہے، رَس ہے اور رعنائی ہے جو ایک طرف اُن کے جذبے کی شدت اور خلوص کی دین ہے تو دوسری طرف اُس میں وہ اسلوبِ بیان بھی برابر کا شریک ہے جو ہندوستانی اور ایرانی عناصر کے دل کش اور متوازن امتزاج کا نتیجہ ہے۔ فارسی زبان و ادب پر ماہرانہ عبور اور قدیم دکنی شاعری کے بنیادی رجحانات سے وابستگی نے اُن کے کلام کو ایک رَچی بسی ہوئی کیفیت اور ایسی رنگینی و رعنائی بخشی ہے کہ سراجؔ کی شاعری اُردو غزل کی ایک منفرد آواز بن گئی ہے۔ ایک ایسی آواز جو دو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی پڑھنے والوں کے لئے دل کش بھی ہے اور نئی بھی۔

سراجؔ کو عموماً صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صاحبِ دل صوفیوں کی صحبت میں بسر کیا۔ وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے اور اُن کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن بہ حیثیتِ مجموعی اُن کے کلام پر تصوف کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ بہ قولِ ڈاکٹر جمیل جالبی اُن کی ضخیم کلیات میں (جو تقریباً ۳۵۰۰/اشعار پر مشتمل ہے) سَو دو سَو اشعار کو چھوڑ کر تصورِ عشق خالصتاً مادی اور مجازی ہے۔ سراجؔ کا تصورِ محبوب دَکنی اُردو کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محبوب محض تخیلی اور روایتی نہیں بلکہ اِسی عالمِ رنگ و بو میں رہنے بسنے والا جیتا جاگتا انسان ہے جو تمام نسوانی محاسن کے ساتھ سامنے آتا ہے اور جسے سراجؔ ''نے گل بدن، موہن، سریجن، پیو اور پری'' وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے:

کہاں ہے گل بدن، موہن ہمارا — کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا
دل پری رُوکوں دیکھ دَنگ ہوا — دشمنِ جان، نام ونگ ہوا
نین کی پُتلی میں اسے سریجن! ترا مبارک مقام دِستا — پلک کے پٹ کھول کر جو دیکھوں تو مجھ کوں ماہِ تمام دِستا

سراجؔ کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔ عشق میں اُن کی اَز خود رَفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اُردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے۔ کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں تصوف

کے مسائل کا کچھ نہ کچھ ذِکر ضرور مل جاتا ہے لیکن اُردو شاعری کی تاریخ میں بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جو عملاً صوفی بھی تھے۔ سراؔج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حُسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔ انہوں نے تصوف کے مسائل کو عشقیہ لب و لہجے میں سادہ، پُر اثر اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ سراؔج کے یہاں فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی ہیں اور درسِ اخلاقیات بھی، دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ بھی ہے، پند و نصیحت بھی ہے اور اعلیٰ اقدار کو اپنانے کی تلقین بھی۔:

دورنگی خوب نئیں، یک رنگ ہوجا — سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا

تُو فنا ہو، اگر بقا چاہے — نیستی میں تُوں دیکھ ہستی ہے

روشن ہے اے سراؔج کہ فانی ہے سب جہاں — مطرب غلط ہے، جام غلط، اَنجمن غلط

بہ قولِ ڈاکٹر جمیل جالبی:

''پوری اُردو شاعری کے پس منظر میں سراؔج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اُردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، مومنؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی روایت کے راستے صاف نظر آرہے ہیں۔ سراؔج نے اُردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔ اِس لئے اُن کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، لَے اور لہجے میں موجود ہے۔''

(تاریخِ ادبِ اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ج ۱/ص ۵۷۳)

09.08 شاہ قاسمؔ اَورنگ آبادی

نام ''شاہ قاسم علی'' اور تخلص ''قاسم'' تھا۔ برہان پور میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی کے زمانے میں اَورنگ آباد آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ والد کا نام ''شیخ عبداللہ انصاری'' تھا جو ایک درویش صفت انسان تھے۔

شاہ قاسمؔ کو چشتیہ اور قادریہ دونوں سلسلوں میں بیعت حاصل تھی۔ چشتیہ سلسلے میں ''شاہ فقیر علی'' کے مرید و خلیفہ تھے جب کہ قادریہ سلسلے میں اُن کے مرشدورَہ نما ''شاہ کرم اللہ بخاری'' تھے۔ تاہم کلام کے مطالعے سے وہ ایک رند مشرب، عشق پیشہ، حُسن پرست، آزاد منش اور قلندر مزاج شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں:

رند مشرب ہیں قلندر، ہم جو چاہیں سو کریں — کوئی ہمارا کیا کرے گا، منصب و جاگیر نئیں

ہم قلندر وضع، بے پروا فقیر — رند مشرب، عاشقِ بے باک ہیں

شاہ قاسمؔ ایک قادر الکلام اور صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ مولوی سخاوت مرزا نے ۱۹۷۵ء میں اُن کے دیوان کو مرتب کر کے انجمن ترقیِ اُردو، کراچی سے شائع کیا ہے۔ شاہ قاسمؔ شاعرانہ کمال کے نقطۂ نظر سے ولؔی اور سراؔج کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن اُنہیں اپنی شاعری پر بہت ناز تھا اور وہ ولؔی کو خود سے کم تر درجے کا شاعر سمجھتے تھے:

آج اِس وقت میں ولؔی نہیں حیف — مجھ سے پوچھیں صلاحِ راہِ سخن

شاہ قاسمؔ کے متعدد اشعار میں خودستائی، شاعرانہ تعلّی اور فخر و مباہات کا اَنداز موجود ہے:

قیامت لگ تمہارے شاہ قاسمؔ! سخن عالم کو یاد آیا کریں گے

شاہ قاسمؔ دکن سیں تا دِلّی کون دیوے ترا حساب سخن

زبان و بیان کے اعتبار سے شاہ قاسمؔ، ولّی اَورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان کو ''ریختہ'' کہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ قاسمؔ کے کلام کو ''بغیر جذبے کی شاعری'' کہتے ہیں۔ تاہم اُن کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں گہرا تاثر اور سوز و نشتریت پائی جاتی ہے۔

ہزار اَفسوس یارب! یہ بہاریں یوں چلی جائیں ہماری آہ، نالوں کی پکاریں یوں چلی جائیں

شاہ قاسمؔ فقیر آتے ہیں عاشقِ بے نظیر آتے ہیں

شاہ قاسمؔ کا حال مت پوچھو! باز آیا ہے زندگانی سیں

09.09 عاجزؔ اَورنگ آبادی

نام ''عارف الدین خاں'' اور تخلص ''عاجزؔ'' تھا۔ اِن کے والد اَورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاجزؔ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ غازی الدین فیروز جنگ نے اِن کے والد کو منصب سے سرفراز کیا۔ عاجزؔ ابھی کم عمر تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد عاجزؔ نواب لشکر خان بہادر نصرت جنگ کے زیرِ سایہ پرورش پاتے رہے۔ نوابِ مذکور کے ہم راہ عاجزؔ ہندوستان سے اَورنگ آباد آئے اور اُنہی کی سفارش کی بہ دولت آصف جاہ اول اور پھر ناصر جنگ شہید کے درباروں تک رسائی حاصل کی۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ عاجزؔ کو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی اور وہ نہایت تیز طبع، بدیہ گو اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کا بیش تر حصہ ضائع ہو گیا۔ اورینٹل مینو اِسکرپٹ لائبریری حیدر آباد میں اُن کے اُردو دِیوان کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔

عاجزؔ نے زیادہ تر مشکل زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور اپنے کلام میں صنائع و بدائع کے اہتمام پر خصوصی توجہ دی ہے جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں سادگی کے بجائے تصنع اور آمد کے بجائے آورد کا احساس ہوتا ہے:

کہتے ہیں سنگلاخ زمینوں میں ہم تو شعر پانا ہماری شوخیِ معنٰی کو ہے بکٹ

سَر ہمارا توڑنے وہ سنگ دل آیا ہے آج مَر مَر اب کیدھر ہے یارو! سنگِ خارا ہے کدھر؟

چمن میں چل کے بجن بے حساب ساغر کھینچ بہارِ رنگِ گلستاں کے سَر سے چادر کھینچ

عاجزؔ نے ۵۰۰/اَبیات پر مشتمل ''لال و گوہر'' کے نام سے ایک مثنوی بھی تصنیف کی ہے جس میں بنگالہ کے شہزادے ''لال'' اور پریوں کی شہزادی ''گوہر'' کی عشقیہ داستان بیان کی ہے۔ اِس مثنوی میں اُس دَور کی دوسری مثنویوں کی طرح محیر العقول واقعات اور مافوق

الفطرت عناصر کی کارفرمائی ہے۔ مثنوی لال و گوہر کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُس کی مقبولیت کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۲۶ء میں میر محمد باقر نے ''حدیقۂ دل'' کے نام سے اُس کو فارسی نثر میں منتقل کیا اور مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اُس کا فرینچ زبان میں خلاصہ بھی لکھا۔ ممبئ اور مدراس میں یہ مثنوی کئی بار چھپ چکی ہے۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے اِس مثنوی کا جدید ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔

09.10 وجدیؔ کرنولی

نام ''حکیم شیخ ہدایت اللہ'' اور تخلص ''وجدی'' تھا۔ اِن کا شمار عہدِ ولیؔ اور سراجؔ کے قادر الکلام سخن وَروں میں ہوتا ہے۔ اِن کے حالاتِ زندگی، تاریخِ پیدائش و وفات اور مدفن پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اِن کے بارے میں صرف اِس قدر پتہ چلتا ہے اِنہیں فنِ طب اور کتابت کے علاوہ علمِ نجوم، موسیقی اور شطرنج سے دل چسپی تھی۔ اِن کی تین مثنویاں دریافت ہوئی ہیں: (۱) مخزنِ عشق (۲) پنچھی باچھا (۳) تحفۂ عاشقاں۔

مخزنِ عشق وجدیؔ کی پہلی مثنوی ہے۔ وجدیؔ نے ''باغِ جاں فزا'' سے اِس مثنوی کی تاریخِ تصنیف ۱۱۴۵ھ خود نکالی ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد و نعت اور خلفائے راشدین کی مدح سے ہوتا ہے۔ اُس کے بعد منقبتِ حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔ پھر وجدیؔ نے اپنے پیر و مرشد حضرت فخر الدین شامی کی مدح کی ہے:

کہوں اب مدح مرشد کا زباں کھول — مبارک ناوں پر گوہر سٹوں رول
جہانِ فقر کا فخرِ گرامی — جسے تھا ناوں فخر الدین شامی

مخزنِ عشق میں وجدیؔ نے کرنول کے نواب اسماعیل خاں پنّی کی تعریف میں ایک باب مختص کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ نوابِ مذکور کے دربار سے وابستہ تھے۔ مخزنِ عشق ایک ضخیم مثنوی ہے جس میں زابلستان کے وزیر ''بیدار دل'' اور فغفورِ چین کی بیٹی ''پری رُخ'' کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی دراصل وجدیؔ کے ایک رفیقِ دیرینہ عبدالقدوس کے مرشد شاہ صادق اورنگ آبادی کے فراہم کردہ فارسی قصے کا دکنی ترجمہ ہے جو شاہ صادق ہی کی فرمائش پر کیا گیا ہے۔

وجدیؔ کی دوسری مثنوی کا نام ''پنچھی باچھا'' ہے جو ۱۱۴۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی شیخ فریدالدین عطارؔ کی مشہور فارسی مثنوی ''منطق الطیر'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ اِس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ وجدیؔ نے عطارؔ کی مثنوی کے مطالب کو آزادانہ طور پر اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ وجدیؔ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ وجدیؔ کی مثنویوں میں ''پنچھی باچھا'' کو اُس کے متصوفانہ موضوع کی وجہ سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مثنوی ممبئ اور مدراس کے مختلف مطابع سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں پروفیسر سید محمد نے اِسے مرتب کر کے سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدرآباد سے شائع کیا۔

وجدیؔ کی تیسری مثنوی کا نام ''تحفۂ عاشقاں'' ہے۔ پنچھی باچھا کی طرح یہ مثنوی بھی شیخ فریدالدین عطار کی ایک فارسی مثنوی ''گل و ہُرمز'' کا دکنی ترجمہ ہے۔ ''تحفۂ عاشقاں'' میں ملکِ روم کے بادشاہ قیصر کے شہزادے ''ہُرمز'' اور حُورستان کے بادشاہ فوزان کی شہزادی ''گل

رُخ'' کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اِس مثنوی کو وجدؔی نے متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے اور دکن کی دوسری مثنویوں کی طرح ہر باب کے عنوان کو ایک شعر کے ذریعے ظاہر کیا ہے جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔ اگر تمام عنوانات کے اشعار کو جمع کر لیا جائے تو مثنوی کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے۔ ''تحفۂ عاشقاں'' اب تک غیر مطبوعہ حالت میں ہے۔ اِس مثنوی میں وجدؔی نے اپنے دور کی تہذیب و معاشرت اور رسم ورواج کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

09.11 خلاصہ

اَورنگ زیب عالم گیر نے ۱۰۹۶ھ مطابق ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کو فتح کیا۔ اِن فتوحات کے نتیجے میں دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اِن سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے دکن میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ اب اِس خطے میں دکنی شاعروں اور ادیبوں کا کوئی سرپرست اور قدردان نہیں رہ گیا۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد وہاں کے شعراو ادیب دُوردراز کے مقامات جیسے کڑپہ، کرنول، ویلور اَور اَرکاٹ چلے گئے جہاں مقامی اُمرا کی سرپرستی کی توقع تھی۔ اِسی طرح گولکنڈہ کے کچھ شعراو ادیب اورنگ آباد چلے گئے جو عالم گیر کا جنوبی مستقر تھا۔ بہ ہر حال دکن کے سیاسی زوال کی وجہ سے یہاں شعروادب کی تخلیق کا سلسلہ بالکل رُکا نہیں بلکہ نئے رُخ سے جاری رہا۔ مغلوں کی فتحِ دکن کی وجہ سے شمالی ہند کے لسانی اثرات دکنی زبان پر مرتب ہوئے اور دکنی زبان پر فارسی الفاظ اور اسالیب کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ ولؔی اور سراجؔ اُس دَور کے سب سے قدآور شاعر تھے۔ اِس لئے اُس دَور کو ''ولؔی اور سراجؔ کا دَور'' کہا جاتا ہے۔ ولیؔ اور سراجؔ کے علاوہ اُس دور میں متعدد شعرا دادِ سخن دے رہے تھے جن میں قاضی محمود بحرؔی، سید محمد فراقؔی، داؤد اَورنگ آبادی، شاہ قاسمؔ، عاجزؔ اور وجدؔی کرنولی وغیرہ اہم ہیں۔

ولؔی کا نام ''ولی محمد'' اور تخلص ''ولی'' تھا۔ اُن کے حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں۔ بعض محققین اُن کو گجرات کا باشندہ کہتے ہیں تو بعض اَورنگ آباد کا۔ تاہم زمانۂ قدیم کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نیز عہدِ حال میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے کے مطابق ولؔی اَورنگ آباد میں پیدا ہوئے جب کہ نوجوانی میں انہوں نے گجرات کا سفر کیا۔

ولؔی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ اُن کی کلیات میں غزل، مثنوی، مخمس، رباعی اور مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔ ولؔی نے دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی پاس داری کی۔ ولؔی کو اُردو غزل کا مجتہد اور امام کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے دکنی غزل کو فارسی مضامین اور فارسی اسالیب سے ملا کر غزل کا ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔ ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں ولؔی نے دلی کا سفر کیا۔ شمالی ہند میں ولؔی کے سفر کے دُور رَس اثرات مرتب ہوئے۔ ولؔی کے اثر سے شمالی ہند کے شعرا نے سنجیدگی کے ساتھ اُردو زبان میں شاعری کا سلسلہ شروع کیا ورنہ اُس سے قبل وہ فارسی زبان میں شاعری کرنے کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ 1132ء/۱۷۱۹ء میں ولؔی کا دیوان دلی پہنچا تو اُن کے اشعار وہاں کے ادبی حلقوں میں نہایت مقبول ہوئے۔

قاضی محمود بحرؔی، ولؔی کے بزرگ ہم عصر شاعر تھے۔ وہ گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے باشندے تھے۔ انہوں نے اُردو اور فارسی زبان میں پچاس ہزار اشعار لکھے لیکن اُن کا یہ ادبی سرمایہ بیجاپور سے حیدرآباد کے سفر کے دوران ڈاکوؤں نے لوٹ کر تباہ کر دیا۔ بحرؔی کی

تصانیف میں ایک دیوان اور دو مثنویاں ''بنگاب نامہ'' اور ''من لگن'' محفوظ ہیں۔ بحرؔی کی غزلوں میں عشقِ مجازی کا رنگ غالب ہے۔ البتہ اُن کی مثنویاں عشقِ حقیقی اور تصوف و عرفان کے مسائل پر مبنی ہیں۔

سید محمد فراقؔی، ولؔی کے کم عمر ہم عصر شاعر تھے۔ ولؔی کی طرح انہوں نے بھی شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔ فراقؔی کی اہم تصنیف مثنوی ''مرآۃ الحشر'' ہے جو تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ فارسی زبان کی مثنوی ''آخرت نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ اِس مثنوی میں قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد پیش آنے والے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ فراقؔی کی غزلوں میں عشقیہ اور ناصحانہ مضامین ملتے ہیں۔

داؤدؔ اورنگ آبادی اُسی دور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں۔ داؤدؔ کے کلام پر ولؔی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ''ولی ثانی'' کہتے تھے۔ داؤدؔ کے دیوان کا بیش تر حصہ محبوب کے خدوخال، لب و رخسار، چشم و اَبرو اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے۔ فراقؔی اور بحرؔی کے مقابلے میں داؤدؔ کی زبان بہت صاف ہے۔

ولؔی کے بعد اُس دور کے دوسرے سب سے بڑے شاعر سراجؔ اورنگ آبادی ہیں۔ سراجؔ نے کم و بیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔ وہ ایک پُر گو شاعر تھے۔ انہوں نے پانچ، چھ سال کی مختصر مدت میں اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔ اُن کی غزل کا محور و مرکز جذبۂ عشق اور سوزِ محبت ہے۔ اُن کی غزلوں میں سوز و گداز، کیف و وارفتگی اور سادگیِ بیان کا احساس ہوتا ہے۔ سراجؔ نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں ''بوستانِ خیال'' نہایت اہم ہے۔ اِس مثنوی میں سراجؔ نے کسی فرضی داستانِ عشق کے بجائے ذاتی واردات بیان کی ہے۔

اُس دور کے ایک اہم شاعر شاہ قاسمؔ اورنگ آبادی ہیں جو صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ وہ ایک رند مشرب، عشق پیشہ، حُسن پرست اور قلندر مزاج شاعر تھے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے شاہ قاسمؔ، ولؔی اورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان کو ''ریختہ'' کہا ہے۔ اُن کے اکثر اشعار میں گہری تاثیر اور سوز و نشتریت پائی جاتی ہے۔

عارف الدین خاں عاجزؔ کا شمار اُس دور کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ نہایت تیز طبع اور برجستہ گو شاعر تھے۔ اُنہیں مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔ ایک اُردو دیوان اور ایک مثنوی ''لال و گوہر'' اُن کی یادگار ہے۔ عاجزؔ کو مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا شوق تھا جس کی وجہ سے اُن کی غزل کے اشعار میں تصنع اور آورد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ عاجزؔ کی مثنوی ''لال و گوہر'' جو ۵۰۰/ اشعار پر مشتمل ہے، اپنے زمانے میں نہایت مقبول ہوئی۔

اُس دور کے ایک اور قادر الکلام شاعر وجدیؔ کرنولی ہیں۔ اُن کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔ دکنی زبان میں اُن کی تین مثنویاں یادگار ہیں۔ ۱۔ مخزنِ عشق ۲۔ پنچھی باچھا ۳۔ تحفۂ عاشقاں۔ اِن میں مخزنِ عشق وجدیؔ کی پہلی مثنوی ہے جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی وجدیؔ نے شاہ صادق اورنگ آبادی کی فرمائش پر لکھی۔ پنچھی باچھا وجدی کی دوسری مثنوی ہے جو ۱۱۴۶ھ میں وجود میں آئی۔ یہ عطارؔ کی مشہور فارسی مثنوی ''منطق الطیر'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ وجدیؔ کی تیسری مثنوی ''تحفۂ عاشقاں'' ہے۔ یہ مثنوی بھی عطارؔ کی ایک مثنوی ''گل و ہُرمز'' کا دکنی ترجمہ ہے۔ وجدیؔ کی مثنویوں میں پنچھی باچھا صوفیانہ مثنوی ہے باقی دو مثنویاں عشقیہ داستانوں پر مبنی ہیں۔

09.12 فرہنگ

آوے	: آئے	ضخیم	: بھاری، بڑا، موٹا
اُپر	: اُوپر	عاشقاں	: عاشقوں
اَنگے	: آگے، سامنے	فقیراں	: فقیروں
اُنوں	: اُنہیں	قدردان	: قدر کرنے والا
بکٹ	: کٹھن، مشکل	کوں	: کو
بھیتر	: اَندر	کیدھر	: کدھر
تجے	: تجھے	کیں	: کہیں
تُوں	: تُو	لباں	: لبوں، ہونٹوں
تئیں	: پاس	لگ	: تک
ٹُک	: کچھ دیر	لیایا	: لایا
جیوں	: جیسے	مجہ	: مجھ
دِستا	: دِکھائی دیتا	مجے	: مجھے
دیوے گا	: دے گا	مُکھ	: چہرہ
سرمایہ	: پُونجی	ناوں	: نام
سُوں	: سے	نزک	: نزدیک
سِیں	: سے	نئیں	: نہیں
شاعراں	: شاعروں	ہووِے گا	: ہوگا
شصت	: ساٹھ/۶۰	یُو	: یہ

09.13 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ولی اَورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اختصار سے لکھیے؟

سوال نمبر۲ : ولی اَورنگ آبادی کی شاعری کے بارے میں اختصار سے لکھیے؟

سوال نمبر۳ : قاضی محمود بحری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سراجؔ اورنگ آبادی کی شاعری کے بارے میں تفصیل سے لکھیے؟

سوال نمبر۲ : ولیؔ اورنگ آبادی کے دو ہم عصر شاعروں کے بارے میں تفصیل سے لکھیے؟

سوال نمبر۳ : کم از کم پانچ دکنی مثنویوں کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''من لگن'' کس دکنی شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) ولیؔ اورنگ آبادی (ب) قاضی محمود بحریؔ (ج) عاجزؔ اورنگ آبادی (د) قاسمؔ اورنگ آبادی

سوال نمبر۲ : ''سید محمود'' کس شاعر کا نام تھا؟

(الف) قاضی محمود بحریؔ (ب) سید محمد فراقیؔ (ج) سراجؔ اورنگ آبادی (د) قاسمؔ اورنگ آبادی

سوال نمبر۳ : ولیؔ اورنگ آبادی کی ملاقات کس بزرگ شاعر سے ہوئی؟

(الف) شیخ شہاب الدین (ب) سراجؔ اورنگ آبادی (ج) سعد اللہ گلشنؔ (د) خواجہ نظام الدین اولیا

سوال نمبر۴ : ''مرآۃ الحشر'' کس دکنی شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) ولیؔ اورنگ آبادی (ب) قاضی محمود بحریؔ (ج) عاجزؔ اورنگ آبادی (د) سید محمد فراقیؔ

سوال نمبر۵ : کس دکنی شاعر نے سراجؔ اورنگ آبادی پر چوٹ کی ہے؟

(الف) قاضی محمود بحریؔ (ب) داؤدؔ اورنگ آبادی (ج) عاجزؔ اورنگ آبادی (د) قاسمؔ اورنگ آبادی

سوال نمبر۶ : ''بوستانِ خیال'' کس دکنی شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) ولیؔ اورنگ آبادی (ب) قاضی محمود بحریؔ (ج) عاجزؔ اورنگ آبادی (د) سراجؔ اورنگ آبادی

سوال نمبر۷ : ''شاہ قاسم علی'' کس دکنی شاعر کا نام ہے؟

(الف) عاجزؔ اورنگ آبادی (ب) داؤدؔ اورنگ آبادی (ج) قاسمؔ اورنگ آبادی (د) قاضی محمود بحریؔ

سوال نمبر۸ : عاجزؔ اورنگ آبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) عارف الدین خان (ب) سراج الدین خان (ج) کمال الدین خان (د) نظام الدین خان

سوال نمبر۹ : ''شیخ ہدایت اللہ'' کا تخلص کیا تھا؟

(الف) وجدیؔ (ب) مہیؔ (ج) نظامیؔ (د) رندیؔ

سوال نمبر۱۰ : ''مخزنِ عشق'' کس دکنی شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) ولیؔ اورنگ آبادی (ب) وجدیؔ کرنولی (ج) عاجزؔ اورنگ آبادی (د) سید محمد فراقیؔ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) قاضی محمود بحرؔی	جواب نمبر۲	: (الف) قاضی محمود بحری
جواب نمبر۳	: (ج) سعداللہ گلشنؔ	جواب نمبر۴	: (د) سید محمد فراقؔی
جواب نمبر۵	: (ب) داؤدؔ اورنگ آبادی	جواب نمبر۶	: (د) سراجؔ اورنگ آبادی
جواب نمبر۷	: (ج) قاسمؔ اورنگ آبادی	جواب نمبر۸	: (الف) عارف الدین خان
جواب نمبر۹	: (الف) وجدیؔ	جواب نمبر۱۰	: (ب) وجدیؔ کرنولی

09.14 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخِ ادبِ اُردو	از	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔ دکن میں اُردو	از	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی
۳۔ دکنی ادب کی تاریخ	از	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
۴۔ سراجؔ اور اُن کی شاعری	از	عبدالقادر سروری
۵۔ مطالعۂ ولیؔ	از	ڈاکٹر شارب رُدَولوی
۶۔ ولیؔ دکنی	از	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۷۔ ولیؔ سے اقبالؔ تک	از	ڈاکٹر سید عبداللہ

بلاک نمبر 03

اکائی 10	اُردوادب کاسنہرادَور	ڈاکٹرنعیم انیس
اکائی 11	اُردوادب کاعہدِ جدید	ڈاکٹراختر علی
اکائی 12	نظیراکبرآبادی کادَور	غلام جیلانی

اکائی 10 : اُردو ادب کا سنہرا دَور

ساخت

10.01 : اغراض و مقاصد

10.02 : تمہید

10.03 : اردو ادب کا پس منظر

10.04 : اردو شاعری کا سنہرا دَور

10.05 : اردو نثر کا عہدِ زریں

10.06 : اردو ادب کے چند اہم نثر نگار

10.07 : خلاصہ

10.08 : فرہنگ

10.09 : نمونہ امتحانی سوالات

10.10 : حوالہ جاتی کتب

10.11 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

10.01 اغراض و مقاصد

اردو ادب کا سنہرا دور ہندوستان کی تاریخ کا وہ عہد ہے جس میں عظیم الشان مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کا آفتاب مائل بہ غروب تھا۔علم و ادب کے مرکز دہلی میں تباہی و بربادی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا تھا۔ان پر آشوب حالات میں بہت سارے اہل کمال دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے لیکن ایسی صورت حال میں بھی ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ جیسے نام وَر شعرا کے علاوہ بہت سے شعرا نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا اور آخری دم تک دہلی کے ہی ہو رہے۔یہی زمانہ دراصل اردو شعر و ادب کے عروج کا وہ زمانہ ہے جسے ہم اردو ادب کا سنہرا دور کہتے ہیں۔اردو ادب کے سنہرے دور سے آپ کو آگاہ کرنے کے لئے یہ اکائی نصاب میں شامل کی گئی ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اردو ادب کے اس سنہرے دور سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

10.02 تمہید

ملکوں کی تاریخ میں ایسے بھی دور آتے ہیں کہ جب سیاسی سطح پر قوم و معاشرہ انتشار کا شکار ہوتا ہے، تہذیبی روایات دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ایک خاص قسم کی بے حسی، ذہنی فرار اور اجتماعی کرب کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ایسے میں ادب عروج کے منازل طے کرتا نظر آتا ہے،اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال اہل فکر کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے۔دراصل ہوتا یہ ہے کہ اجتماعی کرب اظہار کے انفرادی طریقوں

سے سامنے آتا ہے۔ معاشرے کی عام سوچ اور کرب و اضطراب چند اہم تخلیق کاروں کے ذریعہ ادب کا حصہ بنتے ہیں۔ زندگی کے مسائل کا احساس اور بہتر زندگی کی خواہش حقیقت کے ساتھ تخیل کی آمیزش کا سبب بنتی ہے اور اسی لئے اس دور کا ادب بہترین ادب قرار پاتا ہے۔ اردو ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ مغل حکومت کا زوال، سیاسی انتشار اور تہذیبی انحطاط کا دور اردو ادب کا سنہرا دور قرار پاتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی دور کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

10.03 اردو ادب کا پس منظر

جب ہم اردو ادب کے سنہرے دور کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب کے سنہرے دور کا عہد سیاسی، سماجی، اور معاشی سطح پر پریشانیوں اور مصیبتوں کا عہد ہے۔ اورنگ زیب کی وفات 1707ء میں ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔ اس کے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور بخش میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی جس میں شہزادہ معظم فتح یاب ہوکر بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد 1712ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے معزالدین نے جہاں دار شاہ کے لقب سے حکومت سنبھال لی۔ یہ عیش وعشرت کا دل دادہ تھا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے 1713ء میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے بھتیجے فرخ سیر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن 1719ء میں اس کو بھی قتل کر دیا گیا، اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لئے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ تخت نشین ہوئے۔ 1719ء میں جہاں دار شاہ کے بیٹے روشن اختر نے محمد شاہ کے لقب سے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا جو محمد شاہ رنگیلا کے نام سے بھی مشہور ہے۔ محمد شاہ سیاسی اعتبار سے ایک نااہل بادشاہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی اور بیرونی طاقتوں کو سر اٹھانے کا بھرپور موقع ملا اور دلّی پر ہر طرف سے حملے ہونے لگے۔ چہار طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان حالات میں میر تقی میرؔ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ور نہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

محمد شاہ وہ پہلا مغل بادشاہ ہے جس کا کلام ہمیں اردو میں ملتا ہے۔ اسے نہ صرف علم وادب سے لگاؤ تھا بلکہ اس نے کئی راگ راگنیاں، گیت اور ٹھمریاں بھی ایجاد کیں کیوں کہ اسے فنونِ لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا اور اس کے دربار میں کئی نام ور موسیقار بھی تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے بعد حکومت احمد شاہ کو ملی جس کا انتقال **1755**ء میں ہوا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کا بیٹا عزیز الدین عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا لیکن **1716**ء میں اس کا بھی قتل کر دیا گیا اور اورنگ زیب کے پڑپوتے کو شاہ جہاں ثانی کے لقب سے حکمراں بنا دیا گیا۔ شاہ جہاں ثانی کے دور میں اقتدار کی طاقتیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ شاہ جہاں ثانی کو اندھا کر کے تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے **1803**ء میں لارڈ کیننگ کی سربراہی میں دلی پر قبضہ کر لیا لیکن نام بادشاہ کا ہی رہا اور اس کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے ان کی ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں ہی رہی۔ ایسے پرآشوب حالات میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ انگریز بہادر شاہ ظفر کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ کسی بہانے اُنہیں تخت سے بے دخل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر بہادر شاہ ظفر کو **1857**ء کی بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں نومبر 1862ء میں ان کی وفات ہوئی۔

ہر چند کہ یہ دور سیاسی اور سماجی افراتفری کا دور تھا لیکن اس کے باوجود اس عہد میں اردو ادب کو بے حد فروغ ملا اور شعرا و ادبا نے اپنی تخلیقات میں اس عہد کی نہ صرف تصویریں پیش کیں بلکہ احتجاج بھی کیا اور یہیں سے اردو ادب کے سنہرے دور کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اورنگ زیب کی وفات کب ہوئی؟

﴿۲﴾ میر نے دہلی کے حالات پر کون سا شعر کہا؟

﴿۳﴾ بہادر شاہ ظفر کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

10.04 اردو شاعری کا سنہرا دَور

اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کے عروج کا عہد ہے۔ ہر چند کہ یہ عہد سیاسی و سماجی افراتفری اور ہنگامی حالات کا تھا لیکن اس کے باوجود اس عہد میں جس طرح سے شاعری کو فروغ ملا اس بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کا زریں عہد ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مظہرؔ جانِ جانا، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، اِنشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ، اور مومنؔ کے نام آتے ہیں۔

﴿۱﴾ مرزا مظہر جانِ جاناں

مرزا مظہر یوں تو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن اُنہوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ تحقیق کے مطابق ان کا اردو میں کوئی دیوان موجود نہیں ہے البتہ مختلف تذکروں کے حوالے سے ان کے اشعار کی تعداد 124 / بتائی جاتی ہے جسے ''مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا اردو کلام'' کے عنوان سے عبدالرزاق قریشی نے بمبئی سے 1961ء میں شائع کیا۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی، سلاست اور جذبات و احساسات کی حسین آمیزش ہے۔

یہ دل کب عشق کے قابل رہا
کہاں اس کو دماغ و دل رہا

☆☆☆

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

﴿۲﴾ میر تقی میرؔ

میرؔ اردو شاعری کا وہ روشن ستارہ ہے جس کی چمک دمک رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ میر کا عہد احمد شاہ ابدالی، سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے حملے کا دور ہے۔ میرؔ کے عہد میں دلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ میرؔ جیسے حساس شاعر نے اس کی تصویر اپنے کلام میں جگہ جگہ پیش کی ہے۔ میرؔ نے اپنے عہد کی دھڑکن کو اپنی شاعری کے حوالے سے اس طرح پیش کیا کہ ان کی آواز اٹھارہویں صدی کی آواز بن گئی۔ میرؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔ ان کی شاعری کی نغمگی، سوز و گداز، دل کشی اور سلاست نے اُنہیں اردو کا عظیم غزل گو بنا دیا۔ اُنہیں خدائے سخن بھی کہا جاتا ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

☆☆☆

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میرؔ کے چھ دواوین اردو میں ہیں اور ایک دیوان فارسی میں بھی ملتا ہے۔

﴿۳﴾ خواجہ میر دردؔ

دردؔ بحیثیت صوفی شاعر مشہور ہیں کیوں کہ اُنہوں نے ابتدا ہی سے تصوف کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔ اُنہوں نے درویشانہ زندگی گزاری۔ دردؔ کا ایمان ویقین جن چیزوں پر تھا وہ خیالات ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو اردو شاعری کا ایک اہم ستون کہا جاتا ہے۔ سادگی اور زبان کی دل کشی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ شاعری ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ بنیادی طور پر واردات وکیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں ظاہری حسن کا بیان کچھ زیادہ نہیں ملتا بلکہ حسن کا داخلی تصور رکھتے ہیں۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

☆☆☆

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ جہاں تو سما سکے

''دیوانِ دردؔ'' کے نام سے ان کا اردو میں کلام ملتا ہے جس میں تقریباً 1500/ اشعار ہیں۔

﴿۴﴾ سوداؔ

سوداؔ کا عہد وہی ہے جو میرؔ کا ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ اُنہوں نے ابتدا میں فارسی میں شاعری کی۔ پھر خان آرزو کے مشورے پر اردو شاعری کی طرف مائل ہوئے اور بہت جلد اپنا ایک منفرد مقام اردو غزل کے میدان میں بنالیا۔ گو کہ ان کا خاص میدان قصیدہ نگاری ہے لیکن غزل میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مستحکم ہے ۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

☆☆☆

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

﴿۵﴾ سید انشاء اللہ خاں اِنشاؔ

اس عہد کے ایک ممتاز شاعر انشاء اللہ خاں اِنشاؔ ہیں۔ان کے کلام میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اِنشا کو زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، پشتو اور پنجابی سے بھی واقف تھے۔ان کا کلیات اردو ادب کا اہم سرمایہ ہے۔اُنہوں نے غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے یہاں خیال کی تازگی اور بیان کی ندرت اہمیت رکھتی ہے۔

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

☆☆☆

لگی غلیل سے ابرو کی دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہے کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

﴿۶﴾ مصحفی

مصحفی بھی ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے دہلی سے ہجرت کی اور لکھنؤ کو اپنا مسکن بنالیا۔ان کا شمار اردو کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔اردو میں ان کے آٹھ دواوین ہیں۔ان کے کلام میں جذباتیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔زبان و بیان اور فن پر اُنہیں قدرت حاصل تھی۔

تم رات وعدہ کرکے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

☆☆☆

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا

﴿۷﴾ قلندر بخش جرأتؔ

جرأتؔ کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی لیکن بچپن ہی میں لکھنؤ آ گئے اور دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح جرأت نے بھی تصوف سے خود کو الگ رکھا۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں سوقیانہ جذبات، ہوس پرستی اور فحش گوئی در آئی۔البتہ ان کے یہاں زبان و بیان کی صفائی، سادگی اور فصاحت کی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری
وہ منھ کو پھیر کر کہتا ہے اف پناہ تیری

☆☆☆

اپنے پہلو سے جب وہ اٹھ کے چلا اے جرأت
اس کا منھ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

﴿۸﴾ شیخ امام بخش ناسخ

ناسخ کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ناسخ نے شاعری سے زیادہ زبان و بیان کی اصلاح، قواعد اور فنِ شاعری پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں پھیکا پن نظر آتا ہے۔ تصنع اور تکلف سے اُنہوں نے بہت زیادہ کام لیا ہے ان کی حیثیت شاعر سے زیادہ شاعری اور زبان کے مصلح کی ہے۔

مار ڈالا جسے جان کے جوں قاتل نے
زلف مشکیں میں یقین ہے وہ مرا دل ہوگا

☆☆☆

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے، ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

﴿۹﴾ خواجہ حیدر علی آتش

دبستانِ لکھنؤ کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے آتش کا شمار ہوتا ہے۔ آتش نے اپنے کلام میں داخلی اور خارجی موضوعات کا اظہار سلیقے سے کیا ہے جس میں شوخی، رنگینی، روانی اور زبان کی سادگی کا حسن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ شاعری کے حوالے سے آتش کا یہ کہنا ہے کہ شاعر کا رنگین دل کش خیال تصویر بن کر جب شعر کا روپ اختیار کرتا ہے تو اس خیال کے اظہار میں شاعر لفظوں کو ایسے سجاتا ہے جیسے کوئی جوہری نگینے جڑتا ہے۔ آتش کا کلام ان کی اس رائے پر پورا اترتا ہے۔

یہ آرزو تھی، تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

☆☆☆

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان کر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

﴿۱۰﴾ ذوق

ذوق اپنے عہد کے ممتاز و مقبول شاعر تھے۔ آپ شاہ نصیر کے شاگرد اور بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ اُنہیں دربارِ دہلی سے ''خاقانیِ ہند'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ غزل کے علاوہ ذوق کا شمار قصیدے کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ذوق کے کلام کی نمایاں خوبی تازگیِ مضمون، خوبیِ محاورہ، چستی ترکیب اور عام فہمی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کی زبان کا استعمال ذوق نے اپنی غزلوں میں فن کارانہ انداز سے کیا ہے۔ ذوق نے زبان کو سجانے اور سنوارنے کا کام بھی انجام دیا۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

☆☆☆

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

﴿۱۱﴾ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

مرزا غالبؔ سے اردو غزل کے ایک حسین باب کا آغاز ہوتا ہے۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اردو غزل کی فکر کو نہ صرف پرواز عطا کی بلکہ اس میں زندگی کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ ان کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو شوخی اور ظرافت ہے اس لئے حالیؔ نے اُنہیں حیوان ظریف کہا ہے۔ اُنہوں نے اپنی غزلوں میں تصوف، اخلاقی اور حکیمانہ خیالات بھی پیش کیے ہیں۔ اُنہیں حسن و عشق کی کیفیت کے اظہار میں قدرت حاصل تھی۔ غالبؔ اردو زبان کا وہ شاعر ہے جس کے سر پر عظمت کا تاج رکھا گیا اور جب تک دنیا قائم ہے، غالبؔ کا نام اور کلام بھی زندہ رہے گا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

☆☆☆

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

﴿۱۲﴾ حکیم مومن خان مومنؔ

غالبؔ کے ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ مقبولیت مومنؔ کو ملی۔ مومنؔ کی شاعری حسن و عشق اور محبت کے جذبے سے بھری پڑی ہے۔ معاملہ بندی، مضمون آفرینی، مکر شاعرانہ، جذبات نگاری، درد و تاثیر، بے ساختگی اور نازک خیالی ان کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔ مومن کا ایک مشہور شعر ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

کہتے ہیں کہ غالبؔ نے جب یہ شعر سنا تو کہا کہ مومنؔ کے اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہوں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

☆☆☆

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھا
جادو بھرا ہوا ہے تمہارے نگاہ میں

مذکورہ بالا شعرا، اردو غزل کی تاریخ کے وہ اہم اور معتبر نام ہیں جنہوں نے غزل کے ارتقا میں نہ صرف نمایاں حصہ لیا بلکہ اسے سجانے، سنوارنے اور اس کے دامن کو وسعت عطا کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ ذوقؔ کو دربار سے کون سا خطاب ملا تھا؟

﴿۵﴾ مرزا غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بتائیے۔

﴿۶﴾ مومنؔ کے کس شعر پر غالب اپنا دیوان دینے کو تیار ہو گئے تھے؟

10.05 اُردو نثر کا عہدِ زریں

جب ہم اردو ادب کے سنہرے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں شعری اصناف نے زیادہ ترقی کی اور نثر کا کام کم ہوا لیکن بنیادی طور پر نثر کے میدان میں بھی کچھ ایسے کارنامے انجام پائے جن سے اردو نثر کی ایک نئی اور روشن تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اور یہ کام ان کالجوں کے توسط سے انجام پایا جنہوں نے اپنے قیام کے روز اول سے ہی اردو زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دینا طے کر لیا تھا۔ ان میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس)، دہلی کالج (دہلی) اور فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی خدمات اہم اور نا قابل فراموش ہیں۔

﴿۱﴾ فورٹ سینٹ جارج کالج (قیام ۱۷۹۷ء)

۱۷۹۷ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد مدراس کے انگریز گورنر جوزف کالکٹ نے ڈالی۔ اس کالج کو رائٹرس کالج بھی کہا جاتا تھا۔ یہ کالج ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ پہلا ادارہ تھا جہاں منشیوں کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ اس میں کئی شعبے تھے۔ تعلیمی شعبہ، تصنیف و تالیف کا شعبہ، کالج مطبع اور شان دار کتب خانہ۔ اس کالج کے قیام کا بنیادی مقصد کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ یہاں کا شعبۂ تعلیم دکنی، ہندوستانی، اردو عربی، فارسی، سنسکرت، تیلگو، ملیالم، تامل اور کنڑ زبانوں کے شعبہ جات پر مشتمل تھا۔ اس کالج میں وکلا اور جج حضرات کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔ اس کالج کی اردو مطبوعات و مخطوطات زیادہ تر دکنی زبان میں ہیں جن میں حکایت الجلیل، دکنی انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی اور گلستاں کے نام اہم ہیں۔ ان میں ''دکنی انوارِ سہیلی'' کو قدیم اردو کا آخری اہم نثری کارنامہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں صرف و نحو، لغت و قواعد، افسانہ، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات، جیسے موضوعات پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کالج کے مطبع میں پہلی بار 1791ء میں ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب ''ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد و لغت'' شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ دیگر انگریز مصنفین میں تھامس روبک کی کتاب ''لغت جہاز رانی''، کیپٹن گرین اوے کی کتاب ''علی بابا چالیس چور''، ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کی کتاب ''اصول فنِ قبالت'' کا شمار بہترین علمی کارناموں کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس کالج کے ہندوستانی مصنفین میں سے جن لوگوں نے زبان و ادب کی خدمت کی ان میں تراب علی نامی کی کتاب ''خزینۃ الامثال''، سید حسن شاہ حقیقت کی کتاب ''جذبہ عشق''، مہدی واصف کی کتاب ''حکایاتِ لطیفہ''، ابراہیم بیجاپوری کی کتاب ''دکنی انوارِ سہیلی''، منشی شمس الدین احمد کی کتاب ''حکایات جلیلہ''، منشی ظفر کی کتاب ''حیدر نامہ'' نے آسان اور عام فہم نثر نگاری کی روایت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس کالج نے نثر کی فروغ میں بلا شبہ اہم خدمات انجام دیں۔

﴿۲﴾ فورٹ ولیم کالج (قیام ۱۸۰۰ء)

فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں عمل میں آیا۔ اس کالج کے قیام کا اصل مقصد انگریز افسران کو اردو زبان سے واقف کرانا تھا۔ کیوں کہ اس وقت یہی ایک ایسی زبان تھی جو پورے ملک میں ایک حصہ سے دوسرے حصے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو اردو کی مقبولیت کا احساس تھا اور وہ اپنے اقتدار کو مزید مستحکم بنانے رکھنے کے لئے یہ زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ ہر چند کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریزوں کی ایک سیاسی چال تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کالج سے جدید اردو نثر کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور جلد ہی آسان اور سہل اردو نثر کا چلن رائج ہو گیا۔ فورٹ ولیم کالج سے جو نثری کتابیں شائع ہوئیں ان کی زبان عام فہم اور رواں تھی۔ یہاں فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں لکھی گئی تقریباً 56 کتابوں کا سلیس اردو میں ترجمے کا کام انجام پایا۔ فورٹ ولیم کالج کا یہ کارنامہ اردو نثر کی تاریخ میں عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل ڈاکٹر کل کرسٹ نے خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں جن میں ''انگریزی ہندوستانی لغت''، ''اردو کی صرف و نحو''، ''ہندوستانی علم اللسان'' وغیرہ اہم ہیں۔ اس کالج کے منشیوں میں سب سے اہم نام میر امن دہلوی کا ہے جنہوں نے ''باغ و بہار'' جیسی کتاب لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں اپنی عظمت منوالی۔ ''باغ و بہار'' کی مقبولیت کا اہم سبب اس کا اسلوب ہے جس میں ہمیں دلی کی ٹکسالی زبان کا لطف ملتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جتنی شہرت میر امن کے حصے میں آئی، کسی دوسرے مصنف کی اتنی نہیں ملی۔ میر امن کے علاوہ یہاں جن نثر نگاروں نے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا ان میں سید حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للولال جی کوی اور بینی نارائن جہاں کے نام اہم ہیں۔

﴿۳﴾ دہلی کالج (قیام ۱۸۲۵ء)

۱۷۵۲ء میں دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ایک مدرسہ قائم کیا گیا جس کا نام نواب غازی الدین حیدر کا مدرسہ تھا۔ یہ مدرسہ نواب اعتماد الدولہ کی جانب سے ملنے والی رقم سے بنا تھا۔ اس مدرسے کے قیام کا دَور وہ دَور ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں تعلیم کی حالت بے حد ابتر تھی اور اس صورت حال کو مناسب بنانے نیز اس کے معیار کو قائم کرنے کے لئے دلی میں جے ٹیلر کی نگرانی میں جنرل تعلیمی کمیٹی نے تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا۔ مسٹر ٹیلر ہی کی ایما پر نواب غازی الدین حیدر کے مدرسے میں 1825ء میں ایک کالج قائم ہوا جو دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے پرنسپل جے ٹیلر بنائے گئے۔ کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ طلبا میں حصول علم کے لئے دل چسپی پیدا ہو، اس کے لئے وظیفے بھی دیے گئے۔ 1828ء میں یہاں انگریزی کا شعبہ بھی قائم ہوا۔ 1857ء کے ہنگامے نے اس کالج کو بہت نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے سات برس تک یہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام بند رہا۔ مئی 1864ء میں کالج پھر سے کھل گیا اور اسے چاندنی چوک میں منتقل کر دیا گیا۔ 1868ء میں حکومت پنجاب کی جانب سے ایک حکم نامہ جاری کر کے اس کالج کو بند کر دیا گیا اور یہاں کے طلبا اور اساتذہ کو لاہور بھیج دیا گیا۔

دلی کالج شمالی ہند کا وہ پہلا ادارہ تھا جہاں مشرق و مغرب کے صحت مند عناصر موجود تھے۔ اس کالج کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ ریاضی، سائنس، نیچرل فلسفہ اور ہیئت کی تعلیم کا انتظام کر کے اردو زبان و ادب کی ایک شان دار روایت قائم کی۔ اس کالج کی

اہم شخصیتوں میں ماسٹر رام چندر بہاری لال آشوب، اسپرنگر، مملوک علی، شیونارائن آرام، مولوی کریم الدین، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور ضیاءالدین کے نام قابل ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ فورٹ ولیم کالج کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

﴿۸﴾ ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب کا نام کیا ہے؟

﴿۹﴾ فورٹ ولیم کالج کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

﴿۱۰﴾ میر امن کی اس کتاب کا نام بتایئے جسے لازوال شہرت ملی۔

﴿۱۱﴾ دہلی کالج کا قیام کب اور کس کی ایما پر عمل میں آیا؟

﴿۱۲﴾ دہلی کالج سے وابستہ تین اور اہم شخصیتوں کے نام لکھیے۔

10.06 اردو ادب کے چند اہم نثر نگار

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جس جدید اردو نثر کے رواج کا آغاز ہوا اس کا اثر پورے ملک میں پڑا اور اس طرح عام، سادہ، سلیس اور رواں نثر کا چلن شروع ہو گیا جس کی سب سے زندہ اور خوب صورت مثال ہمیں مرزا غالبؔ کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ مرزا غالبؔ کے علاوہ جن نثر نگاروں نے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا، ان میں فقیر محمد خان گویاؔ، رجب علی بیگ سرورؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، عبدالحلیم شررؔ، مرزا ہادی رسواؔ اور منشی سجاد حسین کے نام اہم ہیں۔

﴿۱﴾ مرزا غالبؔ

اردو نثر کے فروغ میں غالب کا نام بڑا اہم ہے۔ غالب عظیم شاعری ہی نہیں بلکہ عظیم نثار بھی تھے جنہوں نے پہلی بار سیدھی سادی، عام فہم اور رواں دواں اردو میں خطوط نگاری کی روایت ڈالی۔ غالب کے یہ خطوط ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ یہ خطوط اردو نثر کا خوب صورت نمونہ ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کا آئینہ بھی ہیں۔ اپنے خطوط کے ذریعہ غالب نے جدید اردو نثر کو ایک نیا رنگ و روپ عطا کیا۔

﴿۲﴾ فقیر محمد گویاؔ

فقیر محمد گویا لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے فارسی زبان کی مشہور کتاب ''انوارِ سہیلی'' کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام ''دبستانِ حکمت'' رکھا۔ اس کتاب کو بے حد مقبولیت ملی لیکن اس کی حیثیت ادبی کم اور تاریخی زیادہ رہی۔ گویاؔ نے انوار سہیلی کا ترجمہ اس طرح کیا کہ اس پر اصل کا گمان ہونے لگا۔

﴿۳﴾ رجب علی بیگ سُرورؔ

رجب علی بیگ سرور کا نام اردو ادب میں جس تصنیف کی وجہ سے لازوال شہرت کا سبب بنا وہ تصنیف ''فسانہ عجائب'' ہے۔ فسانہ عجائب میں سرور نے اپنی بے پناہ نثری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اس کتاب میں لکھنؤ کے تہذیب و تمدن و معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی

ہے۔اس کے مطالعے سے اس دور کا لکھنؤ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔فسانہ عجائب کا اسلوب مسجّع، مقفّیٰ اور مرصع ہے۔ فسانہ عجائب کے حوالے سے سرور کو اردو ادب میں ہمیشہ امتیازی مقام حاصل رہے گا۔

﴿۴﴾ پنڈت رتن ناتھ سرشار

اُردو نثر کی تاریخ میں سرشار کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔اُنہیں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ سرشار کے تخلیقی سفر کا آغاز مختلف اخبارات میں مضامین کے ذریعہ ہوا۔سرشار کی دوسری اہم خوبی یہ بھی کہ وہ ترجمہ نگاری کے فن پر قدرت رکھتے تھے۔اسی بنا پر اُنہیں لکھنؤ کے مشہور اخبار ''اودھ اخبار'' کا مدیر بنایا گیا۔ان کا اہم ادبی کارنامہ ''فسانۂ آزاد'' اسی اخبار میں قسط وار چھپا تھا جو بعد میں 1880ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔سرشار کے یہاں زبان کی گھلاوٹ اور نکھرا ہوا اندازِ بیان ملتا ہے۔سرشار کی دیگر تصانیف میں سیرِ کوہسار، جام سرشار، خدائی فوجدار اور رنگیلے سیار اہم ہیں لیکن اردو ادب میں ان کا نام ''فسانۂ آزاد'' کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

﴿۵﴾ عبدالحلیم شرر

شرر کے ادبی سفر کا آغاز کم عمری میں ہوا لیکن لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' میں ملازمت ملنے کے بعد ان کی شہرت پھیلنے لگی۔1887ء میں شرر نے ''دلگداز'' کے نام سے اپنا رسالہ جاری کیا اور اسی مین متعدد قسط وار ناول لکھنے شروع کیے اور جلد ہی تاریخی ناول نگاری کی دنیا میں ان کا ایک منفرد مقام بن گیا۔ان کا شہرۂ آفاق ناول ''فردوسِ بریں'' ہے۔اس کے علاوہ فلورنڈا، حسن کا ڈاکو، منصور موہنا، زوالِ بغداد اور فتح ہسپانیہ ان کے اہم ناول ہیں۔

﴿۶﴾ مرزا ہادی رسوا

مرزا ہادی رسوا اردو کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔''امراؤ جان ادا، شریف زادہ اور ذات شریف'' ان کے مقبول ناول ہیں لیکن ان کی اصل شہرت ''امراؤ جان ادا'' سے ہوئی جس میں اُنہوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کی زندگی کے شب و روز کو خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مرزا کی زبان صاف، سادہ، سلیس اور رواں ہے۔مرزا کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک طوائف کی زندگی پر ایسا قصہ پیش کیا ہے جس میں حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ان کا طرزِ تحریر خوش گوار اور دل کش ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری اس کے حسن میں کھو جاتا ہے۔

﴿۷﴾ منشی سجاد حسین

اردو نثر کے فروغ میں منشی سجاد حسین کا نام اور ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔اُنہوں نے سیاست، معاشرت، تعلیم، ادب اور مذہب ہر طرح کے موضوعات پر مضامین لکھے۔اُنہوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی تاکہ عوام سے رشتہ برقرار رہے۔ان کا مشہور ناول ''حاجی بغلول'' ہے۔ان کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے ''اودھ پنچ'' کے ذریعہ اردو کے بہت سارے شعرا و ادبا کو متعارف کرایا جنہوں نے اردو ادب کو عروج عطا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ان میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ، نواب سید محمد آزاد، اکبر الٰہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور چکبست کے نام اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۳﴾ مرزا غالب کے خطوط کے مجموعے کا نام بتایئے؟

﴿۱۴﴾ فسانۂ عجائب کس کی تصنیف ہے؟

﴿۱۵﴾ شرر کے دو تاریخی ناولوں کے نام لکھیے۔

10.07 خلاصہ

اُردو ادب کے سنہرے دور کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر پریشانیوں اور مصیبتوں کا عہد ہے۔ اس دور میں مغل حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وقفے سے بادشاہ تبدیل ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس عہد میں اردو ادب کو بے حد فروغ ملا۔ اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کا عہد اردو شاعری کے عروج کا عہد ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مظہرؔ جانِ جاناں، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، اِنشاؔ مصحفیؔ، جرأتؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے نام آتے ہیں۔ مرزا مظہرؔ یوں تو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن اُنہوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ میرؔ کی شاعری کی نغمگی، سوز و گداز، دل کشی اور سلاست نے اُنہیں اردو کا عظیم غزل گو بنا دیا۔ اُنہیں خدائے سخن بھی کہا جاتا ہے۔ دردؔ بحیثیت صوفی شاعر مشہور ہیں کیوں کہ اُنہوں نے ابتدا ہی سے تصوف کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔ سوداؔ کا خاص میدان قصیدہ نگاری ہے لیکن غزل میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اس عہد کے ایک اور ممتاز شاعر انشاء اللہ خاں اِنشا ہیں جنہوں نے غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ مصحفیؔ کے کلام میں جذباتیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ جرأتؔ کے کلام میں سوقیانہ جذبات اور ہوس پرستی و فحش گوئی کے عناصر ملتے ہیں۔ ناسخؔ نے شاعری سے زیادہ زبان و بیان کی اصلاح، قواعد اور فنِ شاعری پر زور دیا۔ آتشؔ نے اپنے کلام میں داخلی اور خارجی موضوعات کا اظہار سلیقے سے کیا ہے جس میں شوخی، رنگینی، روانی کی سادگی کا حسن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ذوقؔ کو اپنی قصیدہ گوئی کی بنیاد پر ''خاقانی ہند'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اردو غزل کی فکر کو نہ صرف پرواز عطا کی بلکہ اس میں زندگی کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ مومنؔ کی شاعری حسن و عشق اور محبت کے جذبے سر بھری پڑی ہے۔ معاملہ بندی، مضمون آفرینی، مکرِ شاعرانہ، جذبات نگاری، درد و تاثیر، بے ساختگی اور نازک خیالی ان کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔

اردو ادب کے اس سنہرے دور میں ہر چند کہ شعری اصناف نے زیادہ ترقی کی لیکن بنیادی طور پر نثر کے میدان میں بھی کچھ ایسے کارنامے انجام پائے جن سے اردو نثر کی ایک نئی اور روشن تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس)، دہلی کالج (دہلی) اور فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی خدمات اہم اور نا قابل فراموش ہیں۔ 1717ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد پڑی۔ اس کالج کے قیام کا بنیادی مقصد کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ اس کالج کے مطبع میں پہلی بار 1791ء میں ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب ''ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کے قواعد و لغت'' شائع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں کلکتہ میں عمل میں آیا اس کالج کے قیام کا اصل مقصد انگریز افسران کو اردو زبان سے واقف کرانا تھا اس کالج سے جدید اردو نثر کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور جلد ہی آسان اور سہل اردو نثر کا چلن رائج ہو گیا۔

اس کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے ''انگریزی ہندوستانی لغت''، ''اردو کی صرف ونحو''، ''ہندوستانی علم اللسان'' جیسی اہم کتابیں ترتیب دی۔اس کالج کے منشیوں میں سب سے اہم نام میر امن دہلوی کا ہے جنھوں نے ''باغ و بہار'' جیسی کتاب لکھ کر اردو نثر کی تاریخ میں اپنی عظمت منوالی۔1825ء میں نواب غازی الدین حیدر کے مدرسے واقع اجمیری دروازہ، دہلی میں ایک کالج قائم ہوا وجود دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔اس کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا۔اس کالج کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ ریاضی، سائنس، نیچرل فلسفہ اور ہیئت کی تعلیم کا انتظام کر کے اردو زبان وادب کی ایک شان دار روایت قائم کی۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جس جدید اردو نثر کے رواج کا آغاز ہوا اس کا اثر پورے ملک پر پڑا اور اس طرح عام، سادہ، سلیس اور رواں نثر کا چلن شروع ہو گیا۔اردو نثر کے فروغ میں غالب کا نام بڑا اہم ہے۔اُنہوں نے پہلی بار سیدھی سادی، عام فہم اور رواں دواں اردو میں خطوط نگاری کی روایت ڈالی۔''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' غالب کے خطوط کے مجموعہ ہیں۔فقیر محمد خاں گویا نے فارسی زبان کی مشہور کتاب ''انوارِ سہیلی'' کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام ''دبستانِ حکمت'' رکھا۔رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' میں لکھنؤ تہذیب وتمدن اور معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔اس کتاب کا اسلوب مسجّیٰ، مقفّیٰ اور مرصع ہے۔سرشار کے تخلیقی سفر کا آغاز مختلف اخبارات میں مضامین کے ذریعہ ہوا۔ان کا اہم ادبی کارنامہ ''فسانۂ آزاد'' ہے۔شرر نے تاریخی ناول نگاری کی دنیا میں ایک منفرد مقام بنایا۔ان کا شہرۂ آفاق ناول ''فردوس بریں'' ہے۔مرزا ہادی رسوا کی اصل شہرت ''امراؤ جان ادا'' سے ہوئی جس میں اُنہوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کی زندگی کے شب وروز کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا۔منشی سجاد حسین کا مشہور ناول ''حاجی بغلول'' ہے۔اس طرح یہ پورا دور اردو ادب کا سنہرا دور قرار پاتا ہے۔

10.08 فرہنگ

آپ بیتی : اپنی کہانی یا اپنا حال بیان کرنا

اجل : موت

پرآشوب : پریشانی اور مصیبت سے بھرا ہوا

تخت نشینی : بادشاہ بننا، تختِ سلطنت پر بیٹھنا

تشبیہات : مشابہت دینا

تکلف : تکلف اٹھا کر کوئی کام کرنا۔بناوٹ، آرائش

توسط : ذریعہ، وسیلہ

جگ بیتی : زمانے کے حالات بیان کرنا

خاقانیِ ہند : خاقانی فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر تھا۔بہادر شاہ ظفر نے ذوقؔ کی قصیدہ نگاری سے متاثر ہو کر اُنہیں ہندوستان کا خاقانی کہا

خدائے سخن : شاعری کا خدا، استادِ سخن

ظرافت : خوش طبعی، تمسخر، مذاق

عروج : بلندی

فتح یاب : فتح حاصل کرنا

فحش گوئی : بیہودہ باتیں کرنا

مرصع : خوش بیانی سے آراستہ، وہ نثر یا نظم جس میں ہر لفظ کے برابر میں دوسرا لفظ اسی وزن یا قافیہ کا ہو

مسجع : وہ عبارت یا مضمون جس میں کافیہ کا اہتمام ہو، قافیہ دار عبارت

مصلح : اصلاح کرنے والا

معاملہ بندی : بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا

مقفّیٰ : قافیہ کیا گیا، قافیہ دار

نامساعد : ناسازگار حالات، موافق نہ ہونا

10.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دلی کالج کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر۲ : میرؔ اور غالبؔ کی شاعری پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : اردو ادب کے سنہرے دور کا پس منظر بیان کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اردو شاعری کے سنہرے دور پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : اردو کے چند اہم نثر نگاروں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : فورٹ سینٹ جارج کالج اور فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں کو بیان کیجیے۔

10.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو نثر کا آغاز وارتقا	از	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
۲۔ دلّی کا دبستانِ شاعری	از	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	از	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۴۔ مختصر تاریخ ادب اردو	از	ڈاکٹر اعجاز حسین

10.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی۔

﴿۲﴾ اب خرابہ ہوا جہاں آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

﴿۳﴾ بہادر شاہ ظفر کی وفات ۱۸۶۲ء میں رنگون میں ہوئی۔

﴿۴﴾ ذوق کو دربارِ دہلی سے ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا تھا۔

﴿۵﴾ غالب کی غزلوں کی خصوصیات میں شوخی، ظرافت، صوفیانہ رنگ، اخلاق اور حکیمانہ مضامین وغیرہ ہیں۔

﴿۶﴾ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

﴿۷﴾ فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام ۱۷۱۷ء میں مدراس میں عمل میں آیا۔

﴿۸﴾ ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب کا نام ''ہندوستانی زبان تجزیہ اور اس کی قواعد ولغت'' ہے۔

﴿۹﴾ فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزم کے ہاتھوں کلکتہ میں عمل میں آیا۔

﴿۱۰﴾ میر امن کی اس کتاب کا نام ''باغ و بہار'' ہے۔

﴿۱۱﴾ دلی کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں جے ٹیلر کی ایما پر عمل میں آیا۔

﴿۱۲﴾ دلی کالج سے وابستہ تین اہم شخصیتوں میں مولوی کریم الدین، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔

﴿۱۳﴾ مرزا غالب کے خطوط کے مجموعوں کا نام ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلّٰی'' ہے۔

﴿۱۴﴾ ''فسانۂ آزاد'' رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ہے۔

﴿۱۵﴾ ''فردوس بریں'' اور ''زوالِ بغداد'' شرر کے تاریخی ناولوں کے نام ہیں۔

اکائی 11 : اُردو ادب کا عہدِ جدید

ساخت

11.01 : اغراض و مقاصد

11.02 : تمہید

11.03 : اردو ادَب کا پس منظر

11.04 : عہد سرسید میں اردو نثر

11.05 : عہد سرسید میں اردو شاعری

11.06 : انجمنِ پنجاب کی تحریک

11.07 : اقبالؔ اور ان کے معاصرین

11.08 : خلاصہ

11.09 : فرہنگ

11.10 : نمونہ امتحانی سوالات

11.11 : حوالہ جاتی کتب

11.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

11.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں اردو ادب کے عہد جدید پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا جائے گا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد عمل اور ردِ عمل کی جو صورت حال تھی اسے سرسید اور ان کے رفقا نے کس طرح سے پرسکون بنایا نیز اردو ادب کو نئی سوچ، نئی فکر، نیا خیال اور اظہار انداز عطا کیا۔ اردو ادب کے عہد جدید میں علامہ اقبال کی کوششیں اور مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات کے کیا اثرات رہے، اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جس کے مطالعہ سے آپ یہ جان جائیں گے کہ اردو ادب کے عہدِ جدید میں کس طرح تبدیلیاں ہوئیں اور اردو ادب نے کس طرح ترقی کی راہیں طے کیں۔

11.02 تمہید

اردو ادب میں عہدِ جدید کا آغاز ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے ہوا جسے ہم پہلی جنگ آزادی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ہر چند کہ اس میں آزادی کے متوالوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا لیکن اس صورت حال نے اردو کے شعرا و اُدَبا کو بیدار کر دیا اور ان کے فکر و عمل میں تبدیلی آنے

لگی جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب کا عہدِ جدید شروع ہو گیا۔ سرسیّد احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال نے نئی روشنی اور نئے راستے دکھائے جس سے اردو نثر اور شعری ادب میں نکھار آیا نیز اردو ادب نے مغربی اثرات بھی قبول کیے۔ خاص طور پر اردو کے نثری ادب پر انگریزی کے نثری ادب اور یورپ کی دوسری زبانوں کی نثر ادبیات کا بھی انگریزی زبان کے توسط سے گہرا اثر پڑا۔ اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی روایت کے ابتدائی نقوش مغرب کے گہرے اثرات کا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ، سوانح، رپورتاژ وغیرہ جیسی نثری اصناف انگریزی زبان وادب کے اثر کا ہی نتیجہ ہیں۔ شاعری میں البتہ موضوعات کے نقطۂ نظر سے تبدیلی آئی لیکن فارم کے لحاظ سے جدید نظم کے علاوہ مغرب کی دوسری اصناف شعر کا اثر اردو شاعری پر کم پڑا۔

11.03 اردو ادب کا پس منظر

۱۸۵۷ء کا سال تاریخ ہند میں بڑا اہم اور انقلابی مانا جاتا ہے کیوں کہ اسی سال پہلی جنگ آزادی کی آواز بلند کی گئی جسے مختصر طور پر ناکامی تو ضرور ملی لیکن اس کی ردعمل سے ہندوستانی سماج کے ہر شعبے میں تبدیلی آنے لگی۔ انگریزوں نے آزادی کے جذبے سے سرشار وطن پرستوں اور قلم کاروں کا قتل کرنا شروع کر دیا۔ اُنہیں سرزمین ہند سے جلاوطن کرنے لگے۔ اہل قلم حضرات نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ نئے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھیں اور ترقی کی جانب قدم بڑھائیں۔ اُنہوں نے اپنی محاسبے پر بھی زور دیا تا کہ ہندوستانی عوام جان پائے کہ ان کے اندر وہ کون سی کمزوریاں اور خرابیاں در آئی ہیں جن کی وجہ سے انگریز ان پر حاوی ہو گئے ہیں۔ جب اس تلخ حقیقت سے ہندوستانی عوام واقف ہوئے تا ان کے اندر اصلاح کا جذبہ بھی بیدار ہوا۔ جس نے زندگی کے ہر شعبے میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، اخلاقی اور تعلیمی شعبے میں بھی خوش گوار انقلاب آئے۔ اس عہد میں بحیثیت مصلح جس شخص نے قوم کی زبوں حالی کو دور کرنے کا بیڑا اپنے سر اٹھایا وہ سرسید احمد خاں کی ذات تھی۔ سرسید نے اصلاح کی جو تحریک شروع کی اسے سرسید تحریک اور علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ سرسید اس دور کے سب سے بڑے دانش وَر اور قلم کار تھے۔ اُنہوں نے سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اردو کے شعرا و ادبا کو نئی روشنی دکھائی تا کہ وہ اپنی سوچ وفکر میں تبدیلی لا سکیں۔ سرسید نے ان کے اندر مغربی علوم وزبانیں سیکھنے کے لئے بھی دل چسپی پیدا کی کیوں کہ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ ہمارے زوال کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم علوم وفنون سے دوٗر رہو گئے ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے حصولِ علم کی جانب سب سے پہلے توجہ دی اور مغربی علوم سیکھنے پر بھی زور دیا۔ چوں کہ اُنہیں علوم کی بدولت مغربی ممالک دنیا میں چھائے ہوئے تھے۔ سرسید نے جہاں مذہبی، سماجی، تہذیبی، معاشی اور تعلیمی زندگی میں تبدیلی پیدا کی وہیں اردو زبان وادب کی بھی اصلاح کا کام کیا۔ اس لئے کہ وہ اردو زبان کے وسیلے سے اپنی بات دوسروں تک پہنچا رہے تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ پہلی جنگ آزادی کی آواز کب بلند ہوئی؟

﴿۲﴾ سرسید کی اصلاحی تحریک کا کیا نام پڑا؟

﴿۳﴾ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ردعمل کیا ہوا؟

11.04 عہد سرسید میں اردو نثر

سرسیّد کا عہد اردو ادب کا ایک اہم دور ہے جس میں نثر اور شاعری کی نہ صرف ترقی ہوئی بلکہ اسے جدید روشنی بھی ملی کیوں کہ سرسیّد کے زمانے تک اردو ادب محدود موضوعات کی گھیرا بندی میں قید تھا یہ موضوعات قصہ کہانی، حسن و عشق اور گل وبلبل کے ذکر سے بھرے پڑے تھے۔ادب حقیقت نگاری سے دور تھا۔سرسیّد نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ ادب کو حقیقت سے قریب کیا جائے۔تکلف اور تصنع کی زبان سے ہٹ کر اُنہوں نے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی اور اپنے رفقا میں بھی یہ رجحان پیدا کیا جس کا خوش گوار اثر اردو ادب پر پڑا اور اس میں ہر قسم کے موضوعات جگہ پانے لگے۔سرسیّد کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے قدیم اندازِ تحریر کو ترک کر کے نیا اندازِ تحریر نہ صرف خود اختیار کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس جانب راغب کیا۔سرسیّد نے ایسے موضوعات پر لکھا جو اس سے قبل اردو ادب میں نہیں لکھے گئے تھے۔سرسیّد کی پہلی کتاب ''آثارالصنادید'' ہے جس میں اُنہوں نے دلّی کی قدیم عمارتوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔سرسیّد نے سائنٹفک سوسائٹی اور اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ بے شمار مضامین لکھ کر اردو ادب کے دامن کو وسعت عطا کی۔ان کا ایک بڑا اور قابل قدر کارنامہ ''خطبات احمدیہ'' ہے جس میں اُنہوں نے انگریز مصنف ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد ﷺ'' کا جواب دیا ہے۔سرسید نے سیاسی موضوعات پر بھی خوب لکھا اور اس کے لئے وہی طرزِ تحریر اختیار کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''اسبابِ بغاوت ہند'' اہم ہے سرسیّد نے قرآن پاک اور انجیل کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی۔ان میں سرسیّد نے تحقیقی انداز اختیار کیا۔سرسیّد کو اپنی بات مدلل انداز میں پیش کرنے پر مہارت حاصل تھی۔اُنہوں نے خالص ادبی نثر کے نمونے اپنے انشائیوں میں پیش کیے جن میں خوشامد، رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات، ریا اور امید کی خوشی اہم ہیں۔آج اردو نثر کی جوشان دار عمارت ہم دیکھ رہے ہیں، اس کی بنیاد دراصل سرسیّد نے ہی ڈالی تھی۔

سرسیّد نے اردو ادب کو جدید روشنی سے منور کرتے ہوئے نہ صرف اپنے مضامین کے ذریعے ایک نئی راہ دکھائی بلکہ اپنے رفقا کے ذریعہ ایک ایسا کارواں بھی تیار کیا جس نے اردو ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ان لوگوں کی ان ہی خدمات کے تحت اُنہیں جدید اردو ادب کے عناصر خمسہ کے نام سے پکارا گیا جو سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر، احمد اور محمد حسین آزاد پر مشتمل ہے۔

☆ خواجہ الطاف حسین حالؔی

سرسیّد کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے حالی نے اردو ادب کی ترقی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔حالی اعلیٰ درجہ کے شاعر، بہترین اِنشا پرداز، نقاد اور باکمال سوانح نگار بھی تھے۔مقدمۂ شعروشاعری ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے اردو میں جدید تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔حالی کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فنِ سوانح نگاری کو عروج پر پہنچا دیا۔حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی ان کی بہترین سوانح عمریاں ہیں۔حالی نے اردو نثر کو ایک نئی شان عطا کی۔حالی کی خوبی یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو سادہ اور سلیس انداز میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ بات فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔

☆ مولانا شبلی نعمانی

سرسیّد کے رفقا میں حالی کے بعد شبلی نعمانی نے اردو نثر کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔اُنہوں نے سوانح نگاری، تاریخ اور تنقید کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ان کی عظیم الشان سوانح عمری ''سیرت النبی ﷺ'' ہے جس میں حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مفصل ذکر ہے۔

اس کے علاوہ اُنہوں نے ''الفاروق، سیرت النعمان، الغزالی اور الماموں'' جیسی سوانح عمریاں بھی تصنیف کیں۔ تنقید کے میدان میں ان کا اہم کارنامہ ''شعر العجم'' اور ''موازنۂ انیس و دبیر'' ہے۔ اُنہوں نے ''الندوۃ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں مذہبی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھ کر اردو صحافت کو ایک وقار عطا کیا۔ مقالاتِ شبلی کے نام سے ان کے مضامین کے کئی مجموعے بھی ملتے ہیں۔

☆ **ڈپٹی نذیر احمد**

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ''مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، ایامیٰ اور رویائے صادقہ'' ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جو 1869ء میں لکھا گیا۔ اپنے ناولوں کے ذریعہ احمد نے سماجی مسائل کی اصلاح کی کامیاب کوششیں انجام دیں۔ صنف ناول کو اردو ادب میں رواج دے کر اُنہوں نے اردو نثر کا دامن وسیع کیا۔ نذیر احمد کا اسلوب سادہ، رواں، برجستہ اور بے ساختہ ہے با محاورہ نثر قلم بند کرنے پر اُنہیں مہارت تھی۔ اُنہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایسی کتابیں بھی لکھیں جو خواتین کے لئے مفید تھیں۔ ناول کے علاوہ نذیر احمد نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور تفسیر بھی لکھی۔ یہ ترجمہ سادہ، سلیس اور با محاورہ زبان میں کیا گیا۔

☆ **محمد حسین آزاد**

سرسیّد کے اہم رفقا میں ایک بڑا نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد کی تصانیف میں ''آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگ خیال، سخن دانِ فارس'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ''آبِ حیات'' کی اہمیت نہ صرف اس کے اسلوب کی وجہ سے ہے بلکہ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اسے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ کا امتیاز حاصل ہے۔ آزاد نے اپنی ان تصانیف کے ذریعہ اردو نثر کو بانکپن اور وقار عطا کیا۔ ان کا اسلوب دل کش اور منور ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اردو نثر کی تعمیر اور اس کے فروغ و ارتقا میں سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے نام نہایت اہم ہیں۔ آج اردو نثر جس مقام پر ہے وہ اُنہیں محسنینِ ادب کی گراں مایہ خدمات کا ثمرہ ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ سرسیّد کی کتاب ''آثار الصنادید'' کیا ہے؟

﴿۵﴾ اردو کے پہلے ناول کا نام بتایئے۔

﴿۶﴾ اردو ادب کے عناصر خمسہ کون ہیں؟

11.05 عہد سرسید میں اردو شاعری

سرسیّد تحریک کا اثر نثر نگاری کے علاوہ شاعری پر بھی پڑا جس نے شاعری میں انقلاب آفریں پیدا کر کے نئی شاعری کی راہیں ہموار کیں۔ سرسیّد نے اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کا کام کیا وہیں شعر و ادب میں بھی تبدیلی لانے کی کوششیں کیں۔ شاعری کے حوالے سے اُنہوں نے کہا کہ ہمیں قدیم انداز ترک کر کے نئے انداز کو تسلیم کرنا چاہیے۔ سرسید کے ان خیالات کو حالؔی نے عملی شکل عطا کی۔ حالؔی نے سرسید کی ایما پر مسدس کی شکل میں اپنی شاہ کار نظم ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی۔ یہ اردو کی پہلی نظم ہے

جس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کو بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا۔اس نظم سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرسید نے اس نظم کے حوالے سے کہا تھا کہ ''خدا اگر مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں نے دنیا میں کون سا اچھا کام کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ میں نے حالؔی سے مدوجزر اسلام لکھوایا ہے۔'' حالؔی نے اس کے علاوہ ملکی، قومی اور دیگر موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں جنہوں نے بعد کے شعرا کو ایک نیا راستہ دکھایا۔حالؔی کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھی اور اس کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

اردو شاعری کو جدید رنگ وروپ دینے میں آزادؔ کی اہم خدمات رہی ہیں۔آزادؔ انجمن پنجاب کے روح رواں تھے اور وہ اس کے جلسوں میں شعرا کو مختلف موضوعات پر نظم لکھ کر لانے کو کہتے اور اس طرح اُنہوں نے غزل کے مقابلے میں نظم کے فروغ کی کامیاب کوشش کی۔وہ خود بھی انجمن پنجاب کے جلسے میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ اپنی موضوعاتی نظمیں بھی سناتے تھے۔اُنہوں نے مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھیں اور اردو کی نظمیہ شاعری میں توسیع کی عملی کوشش کی۔

شبلی نعمانی کا شمار سرسید کے اہم رفقا میں کیا جاتا ہے۔اُنہوں نے سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں جن میں اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ان کی شعری تخلیقات میں مثنوی، مسدس، مرثیہ، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی اور نظمیں شامل ہیں۔

حالؔی کے ہم عصروں میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔یوں تو اُنہیں بچوں کے شاعری کی حیثیت سے شہرت ملی لیکن اُنہوں نے باشعور قارئین کے لئے سنجیدہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔اسماعیل میرٹھی نے اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے عہد کے حالات کو پیش کیا ہے۔ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا وقار ملتا ہے۔اکبرؔ الٰہ آبادی نے اپنے شعری سفر کا آغاز قدیم طرز کی شاعری سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ جدید طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔اسی لئے اُنہیں ''لسان العصر'' کا خطاب ملا۔اُنہوں نے اپنی نظمیں کے ذریعہ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرزِ زندگی پر بھرپور طنز کیے۔ان کا کلام طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔اکبرؔ نے مغربی تہذیب کی اندھی پیروی سے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی

عہدِ سرسید میں نظم نگاری کے علاوہ غزل میں بھی جدید انداز اختیار کیا گیا۔اس سلسلے میں حالؔی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ اُنہوں نے غزل کو حسن وعشق کے موضوعات سے باہر نکال کر اس میں ہر طرح کے مضامین بیان کرنے کی کوشش کی۔اس کے لئے اُنہوں نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر شاعری'' میں غزل کی اصلاح کے حوالے سے اہم مشورے دیے۔حالؔی کے علاوہ منشی امیر احمد مینائی نے غزل کے گیسو سنوارنے کا کام انجام دیا اور اپنی غزل گوئی کی بنا پر اس قدر مشہور ہوئے کہ واجد علی شاہ نے اُنہیں اپنے دربار میں طلب کیا۔ان کی غزلوں کے دو دواوین ''مراۃ الغیب'' اور ''صنم خانۂ عشق'' موجود ہیں امیر مینائی کے اشعار میں شگفتگی، شیرینی اور بلا کی سادگی پائی جاتی ہے۔

داغؔ دہلوی اپنے زمانے کے مشہور ومعروف شاعر تھے۔ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات زبان کی صفائی، سلاست وروانی، شیرینی وبلاغت، بذلہ سنجی اور طنز ومزاح کی دل کشی ہے۔اُنہوں نے ''فریاد داغ'' کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔اس کے علاوہ ان کے شعری سرمائے میں قصائد، قطعات، شہر آشوب اور رباعیات بھی ہیں۔داغؔ کا اردو شاعری کو سب سے بڑا تحفہ یہ ہے کہ اُنہوں نے شاعری کے ذریعہ زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اس کے معیار کو وقار بخشا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ سرسیّد میں نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی فروغ ملا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ ''مدوجزرِ اسلام'' کے حوالے سے سرسیّد نے کیا کہا؟

﴿۸﴾ داغؔ کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔

﴿۹﴾ ''صنم خانۂ عشق'' کس کا شعری مجموعہ ہے۔

11.06 انجمنِ پنجاب کی تحریک

جدید اردو ادب کے حوالے سے جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ اردو شاعری پر اس عہد کے اثرات کس طرح مرتب ہوئے تو پتہ چلتا ہے کہ 21/جنوری 1865ء کو جب لاہور میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پرچم تلے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا اور اس قابلِ تحسین کام کے محرک کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب تھے اور اس تنظیم کے بندوبست کا سہرا گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کے سر رہا۔ آپ ایک ایسے صاحب بصیرت مفکر تھے جنہیں علوم شرقیہ کی بقا سے بے حد دل چسپی تھی۔ اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزادؔ نے اس روایت کا آغاز کیا کہ طرحی مشاعروں کی بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی جائیں۔ ہر مشاعرے کے لئے ایک خاص موضوع پہلے سے طے کر دیا جاتا تھا اور مشاعرہ پڑھنے والے شعرا اس موضوع کے حوالے سے مسلسل نظمیں کہتے تھے۔ آزادؔ نے خود بھی موضوعاتی نظمیں ان مشاعروں میں سنائیں۔ اس روایت کے آغاز کا یہ مثبت پہلو سامنے آیا کہ اردو میں نظم نگاری کی فضا بے حد سازگار ہوگئی۔ انجمن کا پہلا مشاعرہ 30/مئی 1874ء کو ''برسات'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس کے علاوہ ''زمستان، امید، حبِ وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت'' اور ''تہذیب'' وغیرہ اس انجمن کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں کے دیگر موضوعات تھے۔ موضوعاتی مشاعروں کے علاوہ یہاں مختلف مضامین پر بحث ومباحثے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔ ان جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث کی اجازت نے اردو ادب میں صحت مند تنقید کو فروغ دیا جس سے ادب کو فائدہ پہنچا۔

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جدید طرز کے کل 10/مشاعرے ہوئے اور ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد برابر شریک رہے جب کہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے صرف 4/مشاعروں میں اپنا کلام پیش کیا۔ سیاسی اور سماجی نظام کی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے آزادؔ اور حالیؔ نے اس بات کو بخوبی محسوس کیا تھا کہ شاعری میں پرانے اور فرسودہ مضامین کو دہرانے کی بجائے نئے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ انجمن پنجاب کے قیام کے اغراض ومقاصد درج ذیل تھے۔

﴿۱﴾ قدیم مشرقی علوم کا احیا

﴿۲﴾ صنعت وتجارت کا فروغ

﴿۳﴾ باشندگان ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت

﴿۴﴾ علمی وادبی، معاشرتی وسیاسی مسائل پر بحث ونظر

﴿۵﴾ صوبے کے بارسوخ اہل علم طبقات اور افسرانِ حکومت میں رابطہ

﴿۶﴾ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری

انجمن پنجاب کے ان مقاصد کو فروغ دینے کے لئے مدرسے اور کتب خانے قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تا کہ اس کا پیغام دوسری ریاستوں تک پہنچایا جا سکے، اس کے لئے مختلف سماجی، تہذیبی، اخلاقی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر مضامین پڑھنے اور ان پر بحث مباحثے کے لئے ادبی نشستوں کا بھی اہتمام کیا گیا نیز رسائل جاری کرنے کا فیصلہ بھی لیا گیا۔ یوں تو انجمن کے مشاعروں میں بہت سے شعرا نے شرکت کی لیکن حالؔی اور آزادؔ کو بے پناہ شہرت ملی۔ انجمن پنجاب کی تحریک مبالغہ آرائی، تصنع، بناوٹ، بے جا لفاظی اور آرائش کی مخالفت میں پہلی باضابطہ فعال تحریک تھی جس کے مثبت اثرات سامنے آئے اور اردو میں نظم نگاری کا رجحان فروغ پانے لگا۔ انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ 13/ مارچ 1875ء کو ہوا اور اس کا موضوع تہذیب تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۰﴾ انجمن پنجاب کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

﴿۱۱﴾ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام کتنے مشاعرے منعقد ہوئے؟

﴿۱۲﴾ انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ کب ہوا اور اس کا موضوع کیا تھا؟

11.07 اقبالؔ اور ان کے معاصرین

اقبال اور ان کے معاصرین کا دور دنیا کی تاریخ میں سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور ذہنی انقلابات کا دور ہے۔ اس دور کا اردو ادب بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ علمی اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی تباہی سے پوری دنیا جس طرح متاثر ہوئی تھی اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ دنیا کی اس صورت حال کا اثر بھی پڑا جہاں وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے ہر ہندوستانی اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے ملک میں مختلف تحریکیں بھی چل رہی تھیں مثلاً خلافت تحریک، ترکِ مولات کی تحریک، سول نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑ تحریک۔ انگریز ان تحریکوں کو کچلنے کی سازش رچا رہے تھے جس کے لئے اُنہوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی خطرناک پالیسی اختیار کی۔ ان کی یہ پالیسی ہندو مسلم فسادات اور ہندوستان کی تقسیم کا سبب بنی۔

اقبال کا عہد اردو ادب کی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ عہد مختلف ادبی رجحانات اور تحریکوں کا عہد رہا ہے۔ اس عہد میں جہاں 1914ء محمد حسین آزادؔ اور حالؔی کا جدید رنگ نمایاں اور مقبول تھا تو وہیں امیرؔ اور داغؔ قدیم طرز کی شاعری کر رہے تھے ایک طرف ''ادبِ لطیف'' کی تحریک میں رومانیت، حسن پرستی اور ادب برائے ادب کی باتیں بیان کی جا رہی تھیں تو وہیں دوسری طرف پریم چند اور دیگر قلم کار حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کا فلسفہ پیش کر رہے تھے۔ ''ترقی پسند تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے رجحانات کے اثرات بھی اس دور میں ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس عہد کے اردو ادب میں جہاں باغیانہ اور انقلابی رجحانات ملتے ہیں۔ وہیں راویتی انداز بھی نظر آتا ہے۔ اس عہد میں اقبال ایک قد آور دانش وَر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان تمام رجحانات اور تحریکوں کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عہد کو عہدِ اقبال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اقبال کا شمار اردو کے ان عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے جنہوں نے بیک وقت نظم اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے انمٹ نقوش قائم کیے۔ اقبال نے ابتدا میں داغؔ دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور داغؔ کے انداز میں غزلیں بھی کہیں لیکن بہت جلد ان کا اپنا رنگِ سخن ابھر

آیا۔ اقبال کے کلام میں وطن پرستی، فکر وفلسفہ، جستجو اور تجسس، عظمتِ آدم کا تصور اور فلسفہ حیات کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے تین بنیادی عناصر ہیں، خودی، عشق اور عمل۔ اردو میں اقبال کے تین شعری مجموعے ہیں بانگِ درا، بال جبرئیل اور ضرب کلیم ہیں۔

☆ اقبال کے ہم عصر شعرا

اقبال کے ہم عصر شعرا جنہوں نے اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا اور شاعری کو جدید خیالات وافکار سے روشناس کرانے کی اہم کوششیں کیں، ان میں ظفر علی خاں، چکبستؔ لکھنوی، سرورؔ جہاں آبادی، عظمت اللہ خاں، جوشؔ ملیح آبادی، حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، یگانہؔ چنگیزی، جگرؔ مرادآبادی، ریاضؔ خیرآبادی، آرزوؔ لکھنوی جلیلؔ مانک پوری اور فراقؔ گورکھ پوری کے نام اہم ہیں۔

ظفر علی خاں شاعری کے علاوہ صحافی اور نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نظموں کے موضوعات سیاسی ہیں۔ چکبست لکھنوی نے ملک کی آزادی کے حوالے سے پر جوش اور اثر انگیز نظمیں لکھیں۔ چکبستؔ کی حیثیت نقاد کی بھی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ سرورؔ جہاں آبادی کی شاعری جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہے۔ اُنہوں نے تاریخی اور مذہبی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ عظمت اللہ کو اردو کا باغی شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ اُنہوں نے روایت پرستی کی بجائے روایت شکنی کا راستہ اختیار کیا۔ عظمت بہترین انشائیہ نگار بھی تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی کو الفاظ کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم وملک کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ اسی بنا پر اُنہیں ''شاعرِ انقلاب'' بھی کہا جاتا ہے۔ جوشؔ نے سیاسی موضوعات کے علاوہ حسن وشباب کے حوالے سے بھی نظمیں لکھیں اور ''شاعرِ شباب'' کہلائے۔ حسرتؔ موہانی نے غزل کے میدان میں نئے تجربات کرتے ہوئے محبوب کا ایک انوکھا اور دل کش تصور اردو شاعری کو دیا اور اردو غزل کو معنوی اور مصوری دونوں سطح پر تازگی اور توانائی عطا کی۔ فانیؔ بدایونی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے غزل میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔ زندگی کی ناپائیداری، جبر اور بے سمتی کے تجربے نے ان کی شاعری کو المیہ احساس سے پر کر دیا۔ اصغرؔ گونڈوی کی شاعری کا رنگ سب سے الگ ہے۔ اُنہوں نے حسن وعشق کی نئی کیفیات سے اردو غزل کو روشناس کرایا۔ یگانہؔ چنگیزی اپنی طرز کے منفرد اور اہم شاعر ہیں۔ ان کی آواز اردو شاعری میں ایک نئے لب ولہجہ کے ساتھ ابھری جس میں سرکشی اور روایت شکنی کا جذبہ زیادہ ملتا ہے جگرؔ مرادآبادی نے اپنی صلاحیتوں سے اردو غزل کو ایک نئی راہ دکھائی۔ اُنہوں نے غزلوں میں جدائی کے شکوے سے زیادہ فراق میں گذرنے والی کیفیتوں کا اظہار پیش کیا۔ ریاضؔ خیرآبادی نے اپنی غزلوں میں شراب کے مضامین اس خوب صورتی سے باندھے کہ خود کوئی مے خوار شاعر بھی اس کا اظہار اس طرح نہ کر پائے گا۔ جب کہ سچ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے کبھی شراب کو چھوا بھی نہیں۔ آرزوؔ لکھنوی کا شمار غزل گو کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ لکھنؤ کے استاد شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جلیلؔ مانک پوری کی شاعری پر داغؔ کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ فراقؔ گورکھ پوری نے اردو غزل کو ایک خاص رنگ وآہنگ عطا کیا اور ان کی یہی خوبی اُنہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

☆ اقبال کے ہم عصر نثر نگار

عہدِ اقبال اردو نثر کے حوالے سے بھی اہم مانا جاتا ہے۔ اس عہد میں سادہ اور عام نثر کا چلن رائج ہو چکا تھا۔ ترجمے کی شکل میں مغربی علوم اردو ادب کا دامن وسیع کر رہے تھے افسانوی، غیر افسانوی، صحافتی، علمی نثر کے علاوہ مزاحیہ اور طنزیہ نثر کو بھی فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اقبال کی نثر نگاری ان کے خطوط کے حوالے سے ادبی منظر نامے پر آئی جس میں صحافت اور روداد نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اقبال کی نثر کو غیر افسانوی نثر کا درجہ حاصل تھا۔ اس بنا پر اُنہیں غیر افسانوی نثر کا نمائندہ بھی کہا جاتا ہے۔ عہدِ اقبال میں جہاں علمی نثر کا وہیں ادبی نثر کا منظر نامہ

بھی تبدیل ہوا۔ ناول، ڈراما، افسانہ، ناولٹ، افسانچہ، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، خودنوشت، آپ بیتی، روزنامچہ نویسی، سفرنامے، ریپورتاژ، خاکہ نگاری، تحقیق، تنقید، صحافت اور مکتوب نگاری کی روایت بھی مستحکم ہوئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر لحاظ سے یہ عہد اردو ادب کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد میں ناول کے فن کو فروغ دینے والوں مین عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوؔا اور منشی پریم چند کے نام نہایت اہم ہیں جب کہ صنفِ افسانہ نگاری کو ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کرنے کے لئے پریم چند کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، علی عباس حسینی کی کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ ڈراما نگاروں کے میدان میں آغا حشر کاشمیری، حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج نے اس فن کے فروغ کے لئے اہم کارنامے انجام دیے۔ نیاز فتح پوری، مہدی افادی، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور سیّد سلیمان ندوی نے فنِ صحافت کے فروغ میں حصہ لے کر اسے ایک معیار عطا کیا۔ طنز و مزاح کے حوالے سے جو نام منظر عام پر آئے اور اس صنف کی آبیاری کا فریضہ انجام دیا ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کے نام اہم ہیں۔ اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ عہدِ اقبال میں شاعری کے ساتھ ساتھ جدید اردو نثر کی ترقی کا کام بھی منظّم طریقے سے انجام پایا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۰﴾ عہدِ اقبال میں ملک کی آزادی کے لئے کون سی تحریکیں چل رہی تھیں؟

﴿۱۱﴾ اردو میں اقبال کے شعری مجموعے کتنے ہیں؟ ان کے نام لکھیے۔

﴿۱۲﴾ اقبال کے ہم عصر شعرا میں سے کسی تین کے نام بتایئے۔

11.08 خلاصہ

اردو ادب میں عہدِ جدید کا آغاز 1857ء کی بغاوت سے ہوا سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالؔی اور علامہ اقبالؔ نے نئی روشنی اور نئے راستے دکھائے جس سے اردو نثر اور شعری ادب میں نکھار آیا۔ نیز اردو ادب نے مغربی اثرات بھی قبول کیے۔ اس عہد میں بحیثیت مصلح جس شخص نے قوم کی زبوں حالی دور کرنے کا بیڑا اپنے سر اٹھایا وہ سرسید احمد خاں کی ذات تھی۔ اُنہوں نے سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اردو کے شعرا و ادبا کو نئی روشنی دکھائی تاکہ وہ اپنی سوچ فکر میں تبدیلی لاسکیں۔ اسی لئے نھوں نے حصولِ علم کی جانب سب سے پہلے توجہ دی اور مغربی علوم سیکھنے پر بھی زور دیا۔ سرسیّد کے زمانے تک اردو ادب محدود موضوعات کی گھیرابندی میں قید تھا یہ موضوعات قصہ کہانی، حسن و عشق اور گل بلبل کے ذکر سے بھرے پڑے تھے۔ سرسید نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ ادب کو حقیقت سے قریب لایا جائے۔ سرسید نے ایسے موضوعات پر لکھا جو اس سے قبل اردو ادب میں نہیں لکھے گئے تھے۔ سرسید کی پہلی کتاب ''آثارالصنادید'' ہے جس میں انھوں نے دلی کی قدیم عمارتوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے حالی اعلیٰ درجے کے شاعر، بہترین اِنشاپرداز، نقاد اور باکمال سوانح نگار بھی تھے مقدمۂ شعروشاعری ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے ذریعہ اردو میں جدید تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ شبلی نعمانی نے سوانح نگاری، تاریخ اور تنقید کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی عظیم الشان سوانح عمری ''سیرت النبی ﷺ'' ہے۔ نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جو 1869ء میں لکھا گیا۔ اپنے ناولوں کے ذریعہ نذیر احمد نے سماجی مسائل کی اصلاح کی کامیاب

کوششیں انجام دیں۔سرسیّد کے ہم رفقا میں ایک بڑا نام محمد حسین آزاد کا ہے۔آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' کی اہمیت نہ صرف اس کے اسلوب کی وجہ سے بلکہ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اسے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ کا امتیاز حاصل ہے۔

سرسیّد تحریک کا اثر نثر نگاری کے علاوہ شاعری پر بھی پڑا۔حالؔی نے سرسیّد کی ایما پر مسدس کی شکل میں اپنی شاہ کار نظم ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی۔اردو شاعری کو جدید رنگ وروپ دینے میں آزاد کی اہم خدمات رہی ہیں۔اُنہوں نے مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھیں اور اردو کی نظمیہ شاعری میں توسیع کی عملی کوشش کی۔شبلی نعمانی کی شعری تخلیقات میں مثنوی،مسدس،مرثیہ،قصیدہ،غزل،قطعہ،رباعی اور نظمیں شامل ہیں۔اس دور کے شعرا میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا وقار ملتا ہے۔اکبؔرالہٰ آبادی نے اپنے شعری سفر کا آغاز قدیم طرز کی شاعری سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ جدید طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔اسی لئے اُنہیں ''لسان العصر'' کا خطاب ملا۔ان کا کلام طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔عہدِ سرسید میں نظم نگاری کے علاوہ غزل میں بھی جدید انداز اختیار کیا گیا۔منشی امیر احمد مینائی کی غزلوں میں شگفتگی،شیرینی اور بلا کی سادگی پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات زبان کی صفائی،سلاست وروانی،شیرینی وبلاغت،بذلہ سنجی اور طنزومزاح کی دل کشی ہے۔

21/جنوری1865ءکو جب لاہور میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پرچم تلے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔اس انجمن کے ذریعے محمد حسین آزاد نے اس روایت کا آغاز کیا کہ طرحی مشاعروں کی بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھیں جائیں۔موضوعاتی مشاعروں کے علاوہ یہاں مختلف مضامین پر بحث ومباحثے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔ان جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث کی اجازت نے اردو ادب میں صحت مند تنقید کو فروغ دیا جس سے ادب کو فائدہ پہنچا۔اقبال کے دور کا اردو ادب بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔علمی اور سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔آزادی حاصل کرنے کے لئے ملک میں مختلف تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ اقبال کے عہد میں جہاں ایک طرف ''ادبِ لطیف'' کی تحریک میں رومانیت،حسن پرستی اور ادب برائے ادب کی باتیں بیان کی جارہی تھیں تو وہیں دوسری طرف پریم چند اور دیگر قلم کار حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کا فلسفہ پیش کررہے تھے۔ترقی پسند تحریک'' اور حلقۂ اربابِ ذوق'' کے رجحانات کے اثرات بھی اس دور میں ملتے ہیں اس عہد میں اقبال ایک قدآور دانش ور کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔اقبال کے ہم عصر شعرا میں ظفر علی خاں،چکبستؔ لکھنوی،سرورؔ جہاں آبادی،عظمت اللہ خاں،جوشؔ ملیح آبادی،حسرتؔ موہانی،فانؔی بدایونی،اصغرؔ گونڈوی،یگانؔہ چنگیزی،جگرؔ مرادآبادی،ریاضؔ خیرآبادی،آرزوؔ لکھنوی،جلیلؔ مانک پوری اور فراقؔ گورکھ پوری کے نام اہم ہیں۔ عہدِ اقبال اردو نثر کے حوالے سے بھی اہم مانا جاتا ہے اس عہد میں سادہ اور عام نثر کا چلن رائج ہو چکا تھا۔عہدِ اقبال میں جہاں علمی نثر کو فروغ ملا وہیں ادبی نثر کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوا۔ناول،ڈراما،افسانہ،ناولٹ،افسانچہ،انشائیہ نگاری،سوانح نگاری وخودنوشت،آپ بیتی،روزنامچہ نویسی،سفرنامے،رپورتاژ،خاکہ نگاری،تحقیق،تنقید،صحافت اور مکتوب نگاری کی روایت بھی مستحکم ہوئی۔اس عہد میں شررؔ،رسواؔ،پریم چند،سجاد حیدر یلدرم،سدرشن،علی عباس حسینی،آغا حشر کاشمیری،حکیم احمد شجاع،امتیاز احمد تاج،نیاز فتح پوری،مہدی افادی،ظفر علی خاں،عبدالماجد دریاآبادی،مولوی عبدالحق،قاضی عبدالغفار،خواجہ حسن نظامی،برج موہن کیفی،سیّد سلیمان ندوی،فرحت اللہ بیگ،شوکت تھانوی،پطرس بخاری،عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی نے اپنے اپنے میدانِ نثر میں کارہائے نمایاں انجام دے۔

11.09 فرہنگ

آثار	: یادگار چیزیں، جو چیزیں مٹتی نہیں ہیں	فراق	: جدائی
اسلوب	: لکھنے کا انداز، طرزِ بیان	فرسودہ	: پرانا، روایتی
افکار	: فکر کی جمع، سوچ، خیال	فعال	: متحرک
بصیرت	: پرکھ، سمجھ	گراں مایہ	: قیمتی، اہم، قابل قدر
ثمرہ	: پھل، نتیجہ	مبالغہ آرائی	: کسی بات کو حد سے زیادہ بڑھا کر بیان کرنا
دانش وَر	: عقل مند	مثبت	: اچھا، صحیح
رفقا	: رفیق کی جمع، دوست، ساتھی	محاسبہ	: جائزہ لینا
سوانح نگار	: کسی شخص کی زندگی کے حالات لکھنا	مفکر	: غور فکر کرنے والا
صنادید	: صنید کی جمع، اس کے معنی سردار یا بادشاہ کے ہیں	مے خوار	: شراب پینے والا
		ہم عصر	: ایک ہی زمانے کے لوگ

11.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ۱۸۵۷ء کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : سرسیّد احمد خاں کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : حالؔی اور نذیر احمد کی خدمات کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : انجمنِ پنجاب کی تحریک کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : اقبال کے ہم عصر شعرا کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : ''عہدِ سرسیّد میں اردو شاعری'' کا مفصل بیان کیجیے۔

11.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ آج کا اُردو ادب	از	ابواللیث صدیقی
۲۔ اردو ادب کی تحریکیں	از	ڈاکٹر انور سدید
۳۔ تاریخِ ادب اردو	از	پروفیسر نورالحسن نقوی
۴۔ سرسیّد اور ان کے رفقا	از	سیّد عبداللہ

11.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ پہلی جنگِ آزادی کی آواز ۱۸۵۷ء میں بلند ہوئی۔

﴿۲﴾ سرسیّد کی اصلاحی تحریک کا نام سرسیّد تحریک اور علی گڑھ تحریک پڑا۔

﴿۳﴾ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ردِعمل یہ ہوا کہ انگریزوں نے آزادی کے جذنے سے سرشار لوگوں کو قتل کرنا اور اُنہیں وطن سے دور بھیجنا شروع کر دیا۔

﴿۴﴾ ''آثار الصنادید'' میں دلی کی قدیم عمارتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

﴿۵﴾ اردو کے پہلے ناول کا نام ''مراۃ العروس'' ہے۔

﴿۶﴾ اردو ادب کے عناصر خمسہ سرسیّد، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد ہیں۔

﴿۷﴾ ''مدوجزر اسلام'' کے حوالے سے سرسیّد نے کہا کہ خدا اگر مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں نے دنیا میں کون سا اچھا کام کیا ہے تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مدوجزرِ اسلام لکھوایا ہے۔

﴿۸﴾ داغؔ کی شاعرانہ خصوصیات زبان کی صفائی، سلاست وروانی، شیرینی وگھلاوٹ، بذلہ سنجی اور طنز ومزاح کی دل کشی وغیرہ ہیں۔

﴿۹﴾ ''صنم خانہ عشق'' امیر احمد مینائی کا شعری مجموعہ ہے۔

﴿۱۰﴾ انجمن پنجاب کا قیام ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں عمل میں آیا۔

﴿۱۱﴾ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ۱۰ر مشاعرے منعقد ہوئے۔

﴿۱۲﴾ انجمن پنجاب کا آخری مشاعرہ ۱۳ر مارچ ۱۸۵۷ء کو ہوا جس کا موضوع ''تہذیب'' تھا۔

﴿۱۳﴾ عہدِ اقبالؔ میں ملک کی آزادی کے لئے خلافت تحریک، ترکِ موالات، سول نافرمانی تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریکیں چل رہی تھیں۔

﴿۱۴﴾ اردو میں اقبالؔ کے تین شعری مجموعے ہیں۔ بانگِ درا، بالِ جبرئیل اور ضربِ کلیم۔ اس کے علاوہ ارمغانِ حجاز میں بھی ان کا اردو کلام شامل ہے۔

﴿۱۵﴾ اقبال کے ہم عصر شعرا میں حسرتؔ موہانی، چکبستؔ لکھنوی اور جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔

اکائی 12 : نظیرؔ اکبرآبادی کا دَور

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد

12.02 : تمہید

12.03 : نظیرؔ اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی

12.04 : نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم نگاری

12.05 : نظیرؔ اکبرآبادی کی غزل گوئی

12.06 : نظیرؔ اکبرآبادی کی جزئیات نگاری

12.07 : نظیرؔ اکبرآبادی کی عوامی شاعری

12.08 : خلاصہ

12.09 : فرہنگ

12.10 : نمونہ امتحانی سوالات

12.11 : حوالہ جاتی کتب

12.01 اغراض ومقاصد

نظیرؔ اکبرآبادی اُردو شاعری کا وہ اَنمول رَتن ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اَندازہ لگانے میں اُردو ادب کے کئی بڑے جوہری بھی ناکام رہ گئے اور ناکام کیوں نہ ہوتے کہ جو چیز اَنمول ہو، اُس کی قدر و قیمت کا اَندازہ کون لگا سکتا ہے؟ اِس اکائی میں آپ نظیرؔ اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی، اُن کی نظم نگاری، غزل گوئی، جزئیات نگاری اور عوامی شاعری کے علاوہ بہت سی خوبیوں کا مطالعہ کریں گے۔ اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی، امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے اور حوالہ جاتی کتب کی نشان دہی بھی کی گئی ہے تاکہ آپ نظیرؔ اکبرآبادی کے بارے میں اچھی طرح واقف ہوسکیں۔

12.02 تمہید

اُردو زبان وادب کی تاریخ میں نظیرؔ اکبرآبادی غیر معمولی اہمیت کے حامل ایک منفرد اور ممتاز شاعر ہیں۔ اُردو زبان وادب میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز نظیرؔ اکبرآبادی سے ہوتا ہے۔ اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نظیرؔ اکبرآبادی سے پہلے اُردو میں نظم نگاری کا وجود نہیں تھا بلکہ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرا غواصیؔ سے لے کر نظیرؔ اکبرآبادی تک بہت سے شاعروں نے مثنوی، غزل اور قصیدہ نگاری کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کے میدان میں بھی اپنی فکری پرواز کے جوہر دِکھائے ہیں لیکن اِس میدان میں نظیرؔ اکبرآبادی کا نام سنگِ

میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی ذات اپنے تعارف میں کسی دبستان، اِدارے، تحریک، یا رجحان کی محتاج نہیں ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا تعلق نہ تو دبستانِ دہلی سے ہے اور نہ ہی دبستانِ لکھنؤ سے بلکہ وہ اپنے آپ میں خود ایک دبستان ہیں، ایک ایسا دبستان جو خود سے شروع ہو کر خود پر ہی ختم ہو گیا۔ آیئے اِس اکائی میں اُردو زبان کے اِس عظیم شاعر کی زندگی اور شعری خدمات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

12.03 نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی

نظیر اکبر آبادی کا اصل نام ''شیخ ولی محمد'' اور تخلص ''نظیر'' تھا۔ اُن کے والد کا نام ''شیخ محمد فاروق'' تھا۔ نظیر اُن کی تیرہویں اولاد تھے۔ نظیر اکبر آبادی کے والد شیخ محمد فاروق عظیم آبادی سرکار میں ملازم تھے۔ نظیر اکبر آبادی کی ولادت ۱۷۳۵ء میں دہلی میں ہوئی جہاں سے وہ اچھی خاصی عمر میں اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہو گئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے نظیر اکبر آبادی کی طرف سے ایسی بے اعتنائی برتی کہ اُن کی زندگی کے حالات پر پردے پڑے رہے۔ آخر کار ۱۸۹۶ء میں پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ''زندگانیِ بے نظیر'' مرتب کی جسے نظیر اکبر آبادی کی زندگی کے حوالے سے حرفِ آخر قرار دیا گیا۔

اٹھارہویں صدی میں دہلی انتشار اور بربادی سے عبارت تھی۔ مقامی اور اندرونی خلفشار کے علاوہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہی سیلابِ بلا آیا پھر ۱۷۴۸ء، ۱۷۵۱ء اور ۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے پے در پے حملے کیے۔ ایسے نازک حالات میں نظیر اکبر آبادی نے بھی دوسروں کی طرح دہلی چھوڑ کر اکبر آباد کی راہ لی جہاں اُن کے نانا ''نواب سلطان خاں'' قلعہ دار تھے۔ اُس وقت نظیر اکبر آبادی کی عمر ۲۲/۲۳ رسال کے قریب تھی۔ نظیر اکبر آبادی نے فارسی کی سبھی متداول کتابیں پڑھی تھیں اور فارسی کی اہم تصانیف اُن کے زیرِ مطالعہ رہی تھیں۔ نظیر کئی زبانیں جانتے تھے لیکن اُن کو زبان کی بجائے بولی کہنا زیادہ مناسب ہوگا جن کا اثر اُن کی شاعری میں نمایاں ہے۔

آگرہ میں نظیر کا پیشہ بچوں کو پڑھانا تھا۔ اُس زمانے کے مکتبوں اور مدرسوں کی طرح اُن کا بھی ایک مکتب تھا جہاں وہ دوسرے بچوں کے علاوہ آگرہ کے ایک تاجر ''لالہ بلاس رائے'' کے کئی بیٹوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ نظیر اِس تعلیمی پیشے میں قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بھرت پور، حیدر آباد اور اَودھ کے شاہی درباروں نے سفرِ خرچ بھیج کر اُن کو اپنے اپنے یہاں بلانا چاہا لیکن انہوں نے آگرہ چھوڑ کر کہیں اور جانے سے انکار کر دیا۔ درباداری اور وظیفہ خواری کے اُس دور میں اِس سے بچنا ایک مخصوص کردار کا پتہ دیتا ہے۔ نظیر کے متعلق جس نے بھی جو کچھ لکھا ہے اُس نے اُن کے اخلاق و عادات، سادگی، حلم اور فروتنی کا تذکرہ بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ نظیر صوفی مشرب اور صلحِ کل کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس خلوص اور جوش کے ساتھ ہندو مذہب کے بعض موضوعات پر جیسی اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھی ہیں ویسی نظمیں خود ہندو شاعر بھی نہیں لکھ سکے۔

نظیر اکبر آبادی نے زیادہ تر مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اور وہ اُنہی کے لئے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ اُن وفات کے بعد ''لالہ بلاس رائے'' کے بیٹوں نے متفرق چیزیں جمع کر کے پہلی بار ''کلیاتِ نظیر اکبر آبادی'' کے نام سے شائع کیا۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نظیر کا پہلا دیوان ۱۸۲۰ء میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ آگرہ کے مطبع الٰہی نے بہت سے اضافوں کے ساتھ ۱۸۶۷ء اُردو میں اُن کی کلیات شائع کی۔ اُس کے بعد مختلف اوقات میں ''کلیاتِ نظیر'' نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوتا رہی۔ نظیر نے طویل عمر پائی۔ عمر کے آخری حصے میں فالج ہو گیا تھا۔ اُسی حالت میں ۱۸۳۰ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

نظیر اکبر آبادی کے شاگردوں میں میر قطب الدین باطن، (مؤلف تذکرۂ گلستانِ بے خزاں المعروف بہ نغمۂ عندلیب)، گلزار علی اسیر (پسرِ نظیر اکبر آبادی)، مہاراجا بلونت سنگھ راجا، شیخ حسین بخش بخشی، راجا لالہ بدھ سین صافی، شیخ مداری ضمیر، حکیم میر محمدی ظاہر، نبی بخش عاشق، بیدار بخش لہر اور منشی حسین علی خاں لہجہ وغیرہ کے نام نہایت اہم ہیں۔

تذکرہ نگاروں اور اُنیسویں صدی کے اکثر نقادوں نے نظیر اکبر آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کی شاعری میں بازاریت، ابتذال، فنی اغلاط اور عیوب کا ذکر کیا ہے۔ اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظیر نے اپنے دور کے معیارِ شاعری اور کمالِ فن کے نازک اور لطیف پہلوؤں کو زندگی کے عام تجربات کے سادہ اور پُر خلوص بیان پر قربان کر دیا تھا۔ درباری شاعری کی فضا سے دُور رہ کر، موضوعات کے انتخاب اور اُن کے اظہار میں ایک مخصوص طبقے کے ذوقِ شعری کو ملحوظ رکھنے کے بجائے اُنہوں نے عام لوگوں کے فہم اور ذوق پر نگاہ رکھی، یہاں تک کہ زندگی اور موت، منازلِ حیات، مناظرِ قدرت، موسم، تہوار، امارت، افلاس، عشق، مذہب، تفریحات، مشاغلِ زندگی، خدا شناسی، صنم آشنائی، ظرافت اور عبرت وغیرہ جس مضمون پر نگاہ ڈالی، زبان، اندازِ بیان اور تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے پڑھنے والوں کے ایک بڑے دائرے کو نظر میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے سیکڑوں پہلوؤں کے علم، جزئیات سے غیر معمولی واقفیت، وسیع انسانی ہم دردی اور پُر خلوص اظہارِ مطالب کو اہمیت دی جائے تو نظیر اکبر آبادی کے بلند پایہ شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اُنہوں نے فن اور اُس کیا ظہار کے معروف تصورات سے ہٹ کر اپنی نئی راہ نکالی۔ نظیر کی نگاہ میں گہرائی اور فکر میں وزن کی جو کمی نظر آتی ہے اُس کی تلافی اُن کی وسعتِ نظر، خلوص، تنوع، حقیقت پسندی، سادگی اور عوامی نقطۂ نظر وغیرہ سے ہو جاتی ہے اور یہی باتیں اُن کو اُردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی جیسا شاعر تو دُور، اُن کے زمرے کا شاعر بھی نہ اُن سے پہلے کوئی تھا نہ اُن کے بعد کوئی پیدا ہوا۔ نظیر اکبر آبادی اُردو شاعری کی ایک منفرد آواز ہیں۔ اُن کی شاعری اِس قدر عجیب اور حیران کن ہے کہ اُن کے زمانے کے شعری شعور نے اُن کو شاعر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ نظیر سے پہلے اُردو شاعری غزل کے اِرد گرد گھومتی تھی۔ شعرا اپنی غزل گوئی پر ہی فخر کرتے تھے اور شاہی درباروں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قصیدوں کا سہارا لیتے تھے یا رباعیاں اور مثنویاں کہہ کر شعر کے فن میں اپنی استادی ثابت کرتے تھے۔ ایسے عالم میں ایک ایسا شاعر جو بنیادی طور پر نظم کا شاعر تھا۔ اُن شعرا کے لئے غیر تھا۔ دوسری طرف نظیر نہ تو شاعروں میں اپنی جگہ بنانے کے خواہش مند تھے، نہ ہی اُن کو نام و نمود، شہرت یا جاہ و منصب سے کوئی مطلب تھا، وہ ایک خالص شاعر تھے۔ جہاں اُن کو کوئی چیز یا بات دل چسپ اور قابلِ توجہ نظر آئی، شعر بن کر اُن کی زبان پر جاری ہو گئی۔ نظیر کی شاعری میں جو قلندرانہ بانک پن ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ موضوع ہو، زبان ہو یا لہجہ نظیر کا کلام ہر اعتبار سے بے نظیر ہے۔

12.04 نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری

اُردو شاعری پر جس صنفِ سخن کی حکمرانی رہی ہے وہ صرف اور صرف غزل تھی۔ نظیر اکبر آبادی نے پہلی بار ترجیع بند اور ترکیب بند کو (جو مرثیوں کے پیمانے تھے) اُردو نظم کے لئے بَرتا اور اپنی اِس ادبی کاوش میں نظم کے اِس پیرایہ اظہار کی نہ صرف شعوری داغ بیل ڈالی بلکہ وسعت میں اِسے ہم دوشِ ثریا کر دیا اور موضوع میں تنوع کی دل کشی کے ساتھ اِسے آسمان سے ہم کنار کر دیا۔ غزل، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ موضوعات اور ہیئتوں کی پابند تھیں۔ نظیر نے اظہارِ خیال کے لئے نظم میں جو پیرایۂ بیان عطا کیا، وہ کافی طاقت وَر اور توانا تھا جو کہ حُسن و عشق کی

وارداتوں کے بیان پر بھی قدرت رکھتا تھا اور حُسن و عشق کی دنیا سے باہر انسان کے دلی جذبات، عصری حالات، رجحانات، سماجی مسائل، فقر وفاقہ، مناظرِ قدرت، روزی روٹی کے مسائل اور توکل و اِستغنا کے علاوہ ہر طرح کے مظاہر کو اور سماج میں پیش آنے والے واقعات کو من وعن بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

نظیرؔ اکبرآبادی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور انسانی دُکھ، درد کے واقعات کو بیان کرنے پر بھی اُنہیں قدرت حاصل تھی۔ وہ عصری زندگی کو اپنی شاعری کا جزو بنا لیتے تھے۔ مشاہدے کی یہ باریکی اُن کے معاصرین میں کسی حد تک صرف سوداؔ کی شاعری کا حصہ ہے لیکن جس انداز سے نظیرؔ نے اپنی شاعری میں عصری زندگی، میلوں ٹھیلوں، خوشیوں اور غموں کی نقش نگاری کی ہے، قومی یک جہتی کو ایک مقصدِ حیات کے طور پر پیکرِ شاعری میں پیش کیا ہے، مختلف مذاہب کے تئیں جس احترام کو اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا ہے، وہ نظیرؔ کی شاعری کے تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہمارے شعری منظرنامے پر نہیں اُبھر سکا۔ نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم نگاری کو اُردو نظم نگاری میں رہنمایانہ حیثیت حاصل ہے۔

نظیرؔ اکبرآبادی ایک بڑے فن کار اور شاعر تھے۔ وہ اُردو کے علاوہ فارسی اور برج زبان کے بھی عالم تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے اپنے علم، تجربے، عصری زندگی اور ماحول کے تقاضوں سے علمی و ادبی اعتبار سے اگر کچھ لیا ہے تو بہت کچھ دیا بھی ہے۔ نظیرؔ نے اپنے اطراف کی سماجی زندگی، رہن سہن، طرزِ زندگی، میلوں ٹھیلوں، بزرگوں، عرس، مختلف ہندو اور مسلم تہواروں، تاج محل، یہاں تک کہ کورے برتنوں، جانوروں اور حد تو یہ ہے کہ ککڑی جیسی سبزیوں کو بھی انتہائی فن کاری، فلسفیانہ اور علامتی انداز میں نظم کیا ہے۔ عوامی زندگی اور موضوعات کو نظیرؔ نے جس انداز سے پیش کیا ہے اور موضوعات کو جو اہمیت دی ہے، وہ اُن کی فکری بالغ ترقی پسندی تھی۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک پر نظیرؔ کی اِس فکر کے اثرات ہیں۔ نظیرؔ کی اِس ترقی پسندی کا اندازہ نظیرؔ پر ترقی پسند ناقدین مثلاً سید احتشام حسین اور مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کے مضامین سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی ادب اور شاعری سے جو توقعات تھیں، نظیرؔ کی شاعری اُن کے لئے خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

نظیرؔ اکبرآبادی کی فکر اور زندگی کے بارے میں اُن کے رویے میں بڑی وسعت ہے۔ یہ وسیع القلبی اور وسیع النظری اگرچہ اُردو شعر و ادب کا مزاج رہی ہے اور اِسی کی وجہ سے اُردو زبان و ادب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت بنی ہے مگر اِس کی اعلیٰ ترین مثال نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری ہے۔ اِس موضوع کو نظیرؔ کے ناقدین نے سراہا بھی ہے اور اُن کی اِس فکر کا احترام کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے۔ حتیٰ کہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی اِس مثبت فکر اور رَویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اِس کا خوب اعتراف بھی کیا۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے اِس ضمن میں ایک ہندی ناقد کا قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اِس خشک اور اُجاڑ سنگم پر آ کر نظیرؔ نے اَذان بھی دی اور سنکھ بھی پھونکا، تسبیح بھی لی اور جنیو بھی پہنا، محرم میں روئے تو ہولی میں بھانڈ بھی بنے، رمضان میں روزے رکھے تو سلونوں پر راکھی باندھنے کو مچل پڑے، شبرات پر مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی پر دیپ سجائے، نبی، رسول، ولی، پیر، پیغمبر کے لئے جی بھر کے لکھا تو کرشن جی، مہادیو، نرسی، بھیروں اور نانک کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گل و بلبل پر کہا تو آم اور کوئل کو پہلے یاد رکھا۔ پردے کے ساتھ بسنتی ساڑی بھی یاد رہی، اور تو اور گرمی، برسات اور سردی پر بھی لکھا۔ بچوں کے لئے ریچھ کا بچہ، کوا، ہرن، گلہری کا بچہ، تربوز، کنکوے بازی، بلبلوں کی لڑائی، ککڑی، تیراکی، تل کے لڈو پر لکھنے بیٹھے تو بچہ بن

گئے۔ ہر بچہ گلی کوچے میں گاتا پھر رہا ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں کو پند دینے بیٹھے تو لوگ وجد میں آ گئے جیسے قرآن، حدیث، وید، گیتا، اُپنشد، پران سب گھول کر پی جانے والا کوئی پہنچا ہوا بزرگ بول رہا ہو"۔

مذکورہ ساری باتیں ہماری ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی بنیادیں ہیں جن پر اُردو زبان و ادب کو بجا طور پر فخر ہے۔ نظیؔر کی شاعری صرف شاعری نہ ہو کر ہماری قومی تہذیب کا ایک مستند تاریخی دستاویز ہے اور یہی نظیؔر کی بنیادی اہمیت بھی ہے۔ نظیؔر نے اپنے ہم عصروں میں چاہے کوئی بلند مرتبہ نہ حاصل کیا ہو تاہم بعد کی اُردو شاعری پر اُن کے اثرات مرتب ہوئے اور وہ سارے موضوعات اور زندگی کے تئیں رویے بیسویں صدی کی اُردو شاعری کا حصہ بنے۔ جو شاعر اپنے معاصرین میں مقبول نہ ہو سکا، اُس نے بعد کی اُردو شاعری کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اُس کے لئے روشنی کا باعث بھی ثابت ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں اُبھرنے والی ترقی پسند تحریک اور اُس کے موضوعات سب سے پہلے نظیؔر ہی کی شاعری میں نمایاں ہوئے۔ غریبی، افلاس، روٹی، کپڑا، مکان اور محنت، مزدوری وغیرہ یہ سب نظیؔر کی شاعری میں موجود ہیں۔ لہٰذا انفرادی سطح پر وہ اُردو ادب میں ترقی پسندانہ خیالات کے رہ نما تھے۔ نظیؔر کی شاعری کا تنوع اُردو کے نظم گو شاعروں کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ بعد کے آنے والے اُردو شاعروں میں موضوعات کے تنوع کی یہ دولتِ نایاب اقبالؔ اور جوشؔ کا حصہ ہے۔

نظیؔر کے یہاں موضوعات کا جو تنوع ہے وہی تنوع اُن کی نظموں میں بھی ہے۔ اُن کی نظمیں مسدس، مخمس، مثلث، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ مختلف پیرایۂ بیان رکھتی ہیں۔ نظیؔر کے موضوعات عام انسانی زندگی اور اُس کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس سلسلے کی ایک اہم نظم "آدمی نامہ" ہے۔ ساری کائنات آدم اور آدمی ہی کے اِردگرد گھومتی ہے۔ اِس اَشرف المخلوقات کے مختلف رنگ ہیں اور یہ مختلف رنگ اِس کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عام آدمی بھی ہے، بادشاہ و فقیر بھی ہے، نمازی اور پاک باز بھی ہے اور اَبدال وغوث و وَلی بھی ہے۔ اِس کے ہزار رنگ ہیں۔ نظیؔر نے آدمی کی اِس متنوع زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے، اُس سے آدمی کی نفسیات اور سماجی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ "آدمی نامہ" کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

نیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زَردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نماز، یاں — اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ پوری نظم انسانی زندگی کا مرقع ہے جو غیر معمولی مشاہدے، فلسفیانہ اندازِ فکر اور اپنے آہنگ کی وجہ سے ایک شاہ کار نظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ روزی، روٹی کا مسئلہ انسانی سماج کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اِس اہم مسئلے کو بھی نظیؔر نے اپنے غیر معمولی مشاہدے اور بلند فکر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظیؔر کے زمانے میں مارکسی فلسفے اور اِشتراکیت کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا مگر نظیؔر کی فکر میں گہرائی تھی۔ ضروریاتِ زندگی اور اُس میں پیش آنے والے مسائل کا اُنہیں اِدراک تھا۔ وہ گہرا مشاہدہ اور توانا فکر رکھنے والے شاعر تھے اور زندگی میں روزی، روٹی کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بھوکے پیٹ کے ساتھ بھجن نہیں ہوسکتا۔ اُن کی نظم ''روٹیاں'' اِس پس منظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے۔ اِس کے کچھ بند دیکھیے:

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رُخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دِکھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا! خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا! ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو میلے کی سَیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو
بھوکے، غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو سچ ہے کہا کسی نے کہ: بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دِلاتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں رُوپ سب یہ دِکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے ضمیر رُوکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہووے، موٹی، خمیری ہو یا فطیر گیہوں کی، جوار، باجرے کی جیسی ہو نظیؔر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

نظیؔر اکبرآبادی کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اِس نظم میں بھوک کا فلسفہ ہے، اُن کی قلندرانہ بے نیازی ہے جو زندگی جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ اِسی نوعیت اور موضوع پر اُن کی ایک اور نظم ''چپاتیاں'' بھی ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہے۔ یہ نظم اپنے آہنگ سے بھی پہچانی جاتی ہے۔ اِس نظم کا ایک بند پڑھیے:

جب تلک روٹی کا ٹکڑا ہو نہ دسترخوان پر نَے نمازوں میں لگے دل اور نہ کچھ قرآن پر
رات دن روٹی چڑھی رہتی ہے سب کے دھیان پر کیا خدا کا نور برسے ہے، پڑا ہر نان پر

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رِکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

نظیر اکبر آبادی نے روٹی، چپاتی، غربت اور مفلسی کے تجربات خود سہے ہیں۔ یہ اُن کے عہد کے معاشرے کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں ہیں جو اُنہوں نے اپنی نظموں میں پیش کی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی خود اِن تجربات سے گزرے ہوئے ہیں۔ اِس لئے اُن کی شاعری خیال آرائی نہیں بلکہ تجربے کی شاعری ہے، اِسی لئے اُس میں سوز اور دَردمندی ہے۔ اُن کی ایک نظم ''مفلسی'' کا ایک بند دیکھیے :

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

نظیر اکبر آبادی آدمی اور آدمیت کے ثناخواں تھے اور اُس کا احترام کرتے تھے۔ ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اُنہیں اپنے وطنِ عزیز سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ یہاں کی تہذیبی زندگی سے جذباتی طور پر وابستہ تھے اور مذہبی جھگڑوں سے دُور رہتے تھے۔ وہ صلحِ کل کے قائل تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے اُنہیں عقیدت تھی۔ اُن کے مذہبی معتقدات کا کھلے دل سے احترام کرتے تھے البتہ اُنہیں اپنے اسلامی عقائد کا بہت پاس ولحاظ تھا۔ اُنہیں خدا اور رسول سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار اُنہوں نے حمد و نعت میں کیا ہے۔ وہ اپنی ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اُن کی نظموں میں عام اُردو شاعری کے برعکس ہندوستانی زندگی کے اشارے، کنائے اور تلمیحات زیادہ نظر آتی ہیں۔ اُن کی نظم ''بنجارہ نامہ'' جو زندگی کا فلسفہ پیش کرتی ہے، اُس میں بھی اُنہوں نے ہندوستانی فضا بنائی ہے۔ اُس نظم کا ایک بند دیکھیے :

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں! مت دیس بدیس پھرے مارا قزاق اَجل کا لُوٹے ہے، دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئی، پلّا، سَر بھارا کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ، دُھواں کیا، انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ پوری نظم زندگی اور دنیا کی بے ثباتی کا اشاریہ ہے جو توکل اور صوفیانہ تعلیمات کے اَثر کا نتیجہ ہے۔

12.05 نظیر اکبر آبادی کی غزل گوئی

نظیر اکبر آبادی کی شہرت اگر چہ اُن کی نظموں کی بنیاد پر ہے لیکن اُنہوں نے عمدہ اور معیاری غزلیں بھی کہی ہیں مگر اُن کی نظموں کی چکا چوند میں اُن کی غزلوں کا حُسن ماند پڑ گیا۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جتنی توجہ نظیر کی نظم نگاری پر دی گئی ہے، اگر اتنی توجہ اُن کی غزل گوئی پر بھی دی جاتی تو اُردو کے کلاسیکی غزل گو شاعروں میں اگر نظیر کو میر جیسی شہرت و مقبولیت نہ ملتی تو اُن سے کچھ کم بھی نہیں ملتی۔ نظیر نے غزل میں عام طور پر وہی باتیں بیان کی ہیں جو عام طور پر اُردو غزل میں مستعمل ہیں۔ حُسن و عشق، ناز و اَدا، دل لگی و دل فریبی، تصوف، وحدت الوجود اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ اُن کی غزلوں کے موضوعات ہیں۔ اگر آپ نظیر اکبر آبادی کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو اُن کی غزلوں کی لفظیات اور جزئیات نگاری کے حُسن میں کچھ اِس طرح کھو جائیں گے کہ آپ کی زبان سے نظیر اکبر آبادی کی جادو بیانی پر واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی۔ مثال کے طور پر نظیر اکبر آبادی کی یہ غزل پڑھیے:

دِکھا کر اک نظر دل کو نہایت کر گیا بے کل
پری رُو، تند خُو، سَرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھے اُس کو شرمندہ
قمر، خورشید، زُہرہ شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں، اُنگلیوں میں، لعل میں اور چشمِ میگوں میں
حنا آفت، ستم فندق، مسی جادو، فسوں کا جل
بدن میں جامۂ زَرکش، سراپا جس پہ زیب آور
کڑے، بُندے، چھڑے، چھلّے، انگوٹھی، نورَتن، ہیکل
نزاکت اور لطافت وہ کفِ پا تک کہ حیراں ہوں
سمن، گل، لالہ، نسریں، نسترن، دُر، پرنیاں، مخمل
سراسر پُرفریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے
شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پُھرتی، دَغا، چھلبل
نظیر اک عمر عشرت ہو، ملے ایسا پری پیکر
اگر اک آن، اگر اک دَم، اگر اک چھن، اگر اک پل

نظیر اکبر آبادی نے تقریباً ۶۰۰ رغزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اُن کی اکثر غزلیں غزلِ مسلسل کا درجہ رکھتی ہیں جیسے اُن کی یہ غزل پڑھیے:

سحر جو نکلا مَیں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حُسن والا
جھلک وہ مکھڑے میں اُس صنم کے کہ جیسے سورج میں ہو اُجالا
لبوں پہ سرخی وہ پان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے
وہ آن ہنسنے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہی کچھ نرالا
وہ جامہ زیبی، وہ دل فریبی، وہ سج دھج اُس کی، وہ قدِ زیبا
کہ دیکھ جس پر فدا ہوں دل سے، وہ جن کو کہتے ہیں سَروِ بالا
جو لے لیا دل کو میرے یارو! تو اُس نے لی راہ اپنے گھر کی
پڑا تڑپتا مَیں رہ گیا واں، زباں پہ آہ اور لبوں پہ نالا
بہت یہ مَیں نے تو چاہا پوچھوں، مَیں نام اُس کا، و لے وہ گل رُو

نہ مجھ سے بولا، نہ کی اشارت، نہ دی تسلی، نہ کچھ سنبھالا

کبھی تو ہنس کر شتاب آ جا نظیرؔ کی بھی طرف ٹک اے جاں!

بنا کے سج دھج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

نظیرؔ اکبر آبادی کی غزلیں اِس درجے کی ہیں کہ اُنہیں ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر زمانے کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ ایسے عظیم شاعر کو ''بازارُو'' کہہ کر ایک زمانے تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اِس کے باوجود آج ایک زمانہ نظیرؔ اکبر آبادی کا لوہا مان چکا ہے۔ آیئے نظیرؔ اکبر آبادی کی غزلوں کے کچھ بہترین اور دل کو موہ لینے اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں:

حُسن اُس شوخ کا اَہاہاہا جن نے دیکھا، کہا: اَہاہاہا

آن پر آن وہ اَجی، اُوہو اور اَدا پر اَدا اَہاہاہا

کی اُوہو ہو کسی نے دیکھ نظیرؔ کوئی کہنے لگا: اَہاہاہا

☆

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

☆

تھا اِرادہ تری فریاد کریں حاکم سے وہ بھی اے شوخ! ترا چاہنے والا نکلا

☆

حُسن کے ناز اُٹھانے کے سوا ہم سے اور حُسنِ عمل کیا ہوگا؟

تُو جو کل آنے کو کہتا ہے نظیرؔ! تجھ کو معلوم ہے کل کیا ہوگا؟

☆

سب کتابوں کے کھل گئے معنی جب سے دیکھی نظیرؔ! دل کی کتاب

☆

مَے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مَے خانے کو ہم

☆

جسے مول لینا ہو، لے لے خوشی سے مَیں اِس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں

☆

اُس بے وفا نے ہم کو اگر اپنے عشق میں رُسوا کیا، خراب کیا، پھر کسی کو کیا؟

☆

دیکھ لے اِس چمنِ دَہر کو جی بھر کے نظیرؔ! پھر ترا کاہے کو اِس باغ میں آنا ہوگا

☆

یار کے آگے پڑھا یہ ریختہ جا کر نظیرؔ! سن کے بولا: واہ واہ، اچھا کہا، اچھا کہا

☆

جا پڑے چپ ہو کے جب شہرِ خموشاں میں نظیرؔ! یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں؟

☆

اِس قسم کے اَن گنت اشعار نظیرؔ اکبرآبادی کی کلیات میں موجود ہیں جو اُن کی قادرالکلامی، کہنہ مشقی اور اُستادی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگر نظیرؔ اکبرآبادی کے اشعار کو پڑھنے کے بعد اُردو زبان و ادب کا کوئی بھی ناقد اُن کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے دے تو بلاشبہہ جس طرح نظیرؔ اکبرآبادی ایک ''بے نظیر'' شاعر ہیں، اسی طرح اُن کی شاعری بھی ''بے نظیر'' ہے۔

12.06 نظیرؔ اکبرآبادی کی جزئیات نگاری

نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت ''جزئیات نگاری'' ہے۔ جن موضوعات کو دوسرے شعرا معمولی اور سطحی سمجھ کر نظر اَنداز کر دیا، نظیرؔ نے اُنہی معمولی چیزوں پر خاص توجہ صرف کی بلکہ اُن کو اپنی شاعری کا مستقل موضوع بنایا۔ اِس طریقۂ کار سے اُن کی وسعتِ نظر اور گہرے مشاہدے کا اَندازہ ہوتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذِکر اِس انداز سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت میں پڑ جاتا ہے اور اُن کے مشاہدے کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ آخر نظیرؔ کے اندر وہ کون سی صلاحیت ہے جو اُن کی رسائی اپنے موضوع کی تمام جزئیات اور تفصیلات تک کرا دیتی ہے۔ اُن کی شاعری میں جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے بہ کثرت سے ملتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہو یا غم کا، بہار کے منظر کا بیان ہو یا خزاں کا، کسی تہوار کا ذِکر ہو یا پھر کسی مذہب کا، اِن سب موضوعات پر نظیرؔ کے یہاں جزئیات نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شاعری میں جزئیات نگاری کو فطرت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی منظرکشی میں بھی جزئیات نگاری کی کثرت ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی نظم ''ہولی'' کے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے ہولی پر تقریباً دس نظمیں لکھیں۔ اتفاق سے ہر نظم میں جزئیات نگاری کے ساتھ منظر نگاری انتہائے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ سرسری نگاہ ڈالنے والے بس یہی جانتے ہیں کہ ہولی ہندوؤں کا تہوار ہے۔ اِس رات کو آگ جلائی جاتی ہے اور صبح کو رنگوں کا کھیلا جاتا ہے مگر جب نظیرؔ ہولی کا بیان کرتے ہیں تو اُس پر ایک منفرد اور انوکھے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں مناظر کی ایسی باریکیوں تک پہنچ جاتی ہیں جن کو شاید دیکھتے تو سب لوگ ہیں مگر اُن کو اہمیت نہیں دیتے۔ اِس رویے سے پتہ چلتا ہے کہ نظیرؔ اکبرآبادی کائنات کی ہر چیز اور ہر مظہر کو خدا کا کتنا بڑا عطیہ سمجھتے ہیں۔ نظیرؔ اکبرآبادی کی جزئیات نگاری کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

یا سوانگ کہوں، یا رنگ کہوں، یا حُسن بتاؤں ہولی کا سب اَبرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا، دِکھلانا سج دھج شوخی کا ہر گالی، مصری، قند بھری، ہر ایک قدم اِٹکھیلی کا
دل شاد کیا اور موہ لیا، یہ جوبن پایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی کچھ جھڑ پیں بین رُبابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی کچھ گھنگھرو کھٹکے جھم جھم جھم، کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا، یہ تار بندھایا ہولی نے

شاعری میں جزئیات نگاری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور صوتی آہنگ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جب تک شاعر الفاظ کے مناسب ترین انتخاب اور اُن کے انفرادی استعمال سے واقف نہیں ہوگا تب تک وہ اچھی شعری مصوری نہیں کرسکتا۔ اِس لئے جب نظیر کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پہلے اُس سے متعلق معمولی سے معمولی تفصیلات پر غور کرتے ہیں اور اُن جزئیات اور تفصیلات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اُن کے لئے مناسب ذخیرہِ الفاظ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ نظیر کے کلام میں جزئیات نگاری کی دو جہتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو وہ انسان کے وجود اور اُس کے متعلق تفصیلات اور انسانوں کے ہجوم میں شخصی خصوصیات اور انفرادی پہچان کا تعین کرتے ہیں اور دوسری طرف انسان مشاہدہِ کائنات کے ذریعے جن جن جزئیات سے اَثر قبول کرتا ہے، اُن کائناتی مظاہر کی تفصیل کو بھی کبھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ موسم کی تبدیلی، وقت کی تبدیلی، مناظرِ قدرت کا تنوع جیسی تمام چیزیں اُن کے کلام میں الگ الگ کرکے دیکھی اور پہچانی جاسکتی ہیں۔ اُن کی جزئیات نگاری کہیں منظر نگاری بن جاتی ہے، کہیں تصویر کشی کا گمان گزرتا ہے اور کہیں عقل کو حیران کردینے والی صورتِ حال اُن کے یہاں نمایاں ہوتی ہے۔ اِس ضمن میں برسات کے موضوع پر اُن کی متعدد نظمیں ہیں جن کی جزئیات نگاری خاص اہمیت رکھتی ہے مثلاً ''برسات اور پھسلن، برسات کا تماشا، بہار، برسات کی بہاریں اور جاڑے کی بہاریں وغیرہ نظمیں بہت اہم اور مقبول ہیں۔ نظم ''برسات کی بہاریں'' کام یاب اور متنوع تصویروں سے بھری پڑی ہے۔ یہ نظم چلتی پھرتی تصویروں کا ایک نگارخانہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے جن میں پانی کے زور کو انوکھے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے:

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اَٹاری، کوٹھا ندان ٹپکا باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

برسات سے جس طرح مکانات پناہ مانگتے ہیں، یہ بات سب کو معلوم ہے لیکن نظیر مکان کے ایک ایک جزو کو نشان زَد کرکے اپنے بیان کو سب سے الگ اور اتنا زوردار بنا دیتے ہیں کہ یہ کیفیت کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے گی۔ اِس نظم میں ایک طرف تو برسات کے نتیجے میں مکان کے ٹپکنے کا ذکر ہے، پھر آگے چل کر کیچڑ کا یہ عالم دکھایا گیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے کیچڑ سے متاثر زمین، انسان کی بے بسی، لوگوں کا پھسلنا، گندگی کی افراط وغیرہ کی نہایت متحرک تصویریں اِس طرح سامنے آجاتی ہیں کہ ناپسندیدہ منظر بھی دل چسپ اور قابلِ توجہ بن جاتا ہے:

گر کر کسی کے کپڑے دَلدل میں ہیں معطر پھسلا کوئی، کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں، پھسلتے کچھ اِس میں آن اکثر ہوتے ہیں سیکڑوں کے سر نیچے، پاؤں اُوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اُٹھے ہیں مَر مَر، کتنے اُکس رہے ہیں وہ دُکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

پہلے بند میں برسات کا اگر منفی اور پریشان کن منظر سامنے آتا ہے تو دوسرے بند میں برسات کے موسم کی خوش گواری اور موسم کے معتدل ہو جانے کے سبب جو خوشی اور مسرت کا ماحول بن جاتا ہے اُس پر بھی نظیر کی نگاہ رہتی ہے۔ یہ نظیر کی ایسی خصوصیت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی جزئیات نگاری میں دنیا میں پائے جانے والے تضادات کو بھی ضرور نمایاں کر دیتے ہیں۔ وہ منظر کی مناسبت سے اِس طرح لفظوں کا استعمال کرتے ہیں کہ لفظوں کے اُتار چڑھاؤ، موسیقیت اور مترنم الفاظ کے استعمال سے قاری کی آنکھوں کے سامنے نہ صرف خوشی کا منظر پیش کر دیتے ہیں بلکہ شاعرانہ حُسن کاری کا بھی ثبوت دیتے ہیں:

کتنے شراب پی کر، ہو مست چھک رہے ہیں مَے کی گلابی آگے، پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر، گھنگھرو جھنک رہے ہیں پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ، طبلے کھڑک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

یہ نظم بہت طویل ہے تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر نظیر نے کیا کیا پہلو نکالے ہیں۔ اِس نظم میں جگہ جگہ اپنے وطن کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور مختلف قسم کی صورتِ حال کو مختلف الفاظ اور تراکیب کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ برسات کے نتیجے میں پیش آنے والی ہر تصویر میں حقیقت کی جھلک ملتی ہے اور کوئی بھی تصویر مصنوعی نہیں معلوم ہوتی۔ دراصل نظیر حد درجہ حقیقت نگار شاعر تھے۔ جو چیزیں وہ اپنے گرد و پیش میں دیکھتے تھے، اُس میں مشاہدے کی باریکی سے نت نئے گوشے پیدا کر لیا کرتے تھے۔

نظیر کی جزئیات نگاری کے فن کا بہترین نمونہ اُن کی نظم ''پری کا سراپا'' ہے۔ اِس نظم جیسی کوئی دوسری مثال اُردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ یہ نظم جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اِس نظم میں پری کے پردے میں عورت کی فطرت کے بہت سے نکات سامنے لائے گئے ہیں۔ عورت کے حُسن اور ناز و اَدا سے لے کر زیورات اور لباس تک کے استعمال میں چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر الگ الگ بند سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

خوں ریز کرشمہ، ناز و ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے
مژگاں کی سناں، نظروں کی اَنی، اَبرو کی کھچاوٹ ویسی ہے
بے درد، ستم گر، بے پروا، بے کل، چنچل، چٹکیلی سی
دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
چہرے پر حُسن کی گرمی سے ہر آن چمکتے موتی سے
خوش رنگ پسینے کی بوندیں، سو بار جھمکتے موتی سے
وہ کافر دَھج جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے
پازیب، کڑے، پایل، گھنگھرو، کڑیا، چھڑیاں، گجرے، توڑے

نظیر کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن سے اُن کے مشاہدۂ فطرت اور تجزیہ نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں الفاظ کے ذریعے پیکر تراشی کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ شاعری کا ایک اہم جز ومصوری ہے جس کے بغیر اعلیٰ شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ نظیر حرکت اور آوازوں کے صوتی آہنگ سے بھی اپنی شعری تصویروں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ نظم ''روپے کی فلاسفی'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

نقشہ ہے عیاں سو طرب و رقص کی رَے کا ہے ربط بہم طبلہ و سارنگی و نَے کا
جھنکار مجیروں کی ہے اور شور ہے لَے کا مینا کی جھلک، جام اُدھر چھلکے ہے مَے کا
جھمکا نظر آتا ہے ہر اک عیش کی شَے کا
دنیا میں عجب رُوپ جھلکتا ہے رُوپے کا

ایک طرف ''طرب و رقص'' کی رعایت سے ''طبلہ، سارنگی اور نے'' کا استعمال ہے تو دوسرے شعر میں ''مجیرے'' کی مناسبت سے ''جھنکار اور شور'' کا ذکر ہے تو دوسری طرف ''شراب، جام اور مینا'' کے چھلکنے کے تلازمات کے استعمال سے نظیر نے ایک نیا ماحول پیدا کر دیا ہے۔

اُن کی نظم ''جھونپڑا'' بھی حسبِ معمول تفصیل اور جزئیات نگاری سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں کوئی پُر امید منظر تو نہیں مگر اِس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نظیر دولت اور غربت یا نشیب اور فراز سے متعلق دونوں پہلوؤں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں:

یہ تن جو ہے ہر اک کے اُتارے کا جھونپڑا اِس میں ہے اب بھی سب کے سہارے کا جھونپڑا
اِس سے ہے بادشہ کے نظارے کا جھونپڑا اِس میں ہی ہے فقیر بچارے کا جھونپڑا
اپنا نہ مول کا نہ اِجارے کا جھونپڑا
بابا! یہ تن ہے، دم کے گزارے کا جھونپڑا

اِس نظم میں انسانی مساوات کے ذِکر کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری سے بھی پوری طرح کام لیا گیا ہے۔ اِس جھونپڑے میں بھولے بھالے، سیانے، ہوشیار اور دیوانے ہیں، اِسی میں اپنے اور بے گانے ہیں، اِسی میں عشق و محبت کرنے والوں کی گزر ہے اور اِسی میں شوخ چاند ستاروں کا مقام ہے، اِسی میں دوست اور پیارے، اہلِ دولت، اَمیر بھی ہیں اور اِسی میں سارے جہاں کے فقیر بھی بستے ہیں۔ نظم کے اختتام پر پتہ چلتا ہے کہ شاہ، وزیر، چور، ٹھگ، کوتوال، پارسا، رند، وکیل اور بخشی وغیرہ سب اِسی جھونپڑے کے مکین ہیں۔ دیکھا جائے تو نظم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے مگر اُنہوں نے انسانی مساوات کے اِس بنیادی پہلو کو جس طرح سے دیکھا ہے وہ اُردو شاعری کے اُفق پر اِس سے پہلے نظر نہیں آتا۔ نظیر نے طرح طرح کے موضوعات کی جزئیات اور تفصیل اتنی کثرت کے ساتھ پیش کی ہیں کہ اُن کی شاعری کا بدل زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اِن مختلف النوع موضوعات اور اِن کی جزئیات نگاری کے لئے اُن کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ بھی اتنا ہے کہ اِس ضمن میں نظیر، میر انیس سے بھی بازی لے گئے ہیں۔

شاعرانہ منظر نگاری کرنے میں جزئیات سے سروکار رکھنا لازمی ہے مگر نظیر کا امتیاز یہ ہے کہ معاملہ منظر نگاری کا ہو یا جذبات نگاری کا، وہ حکمت اور تصوف کے موضوع پر اظہارِ خیال کریں یا عشق و محبت کے معاملات پر شعر لکھیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر اپنی جزئیات نگاری کا کمال

ضرور دکھاتے ہیں۔ زندگی کے روشن پہلوؤں کے ساتھ تاریک پہلو بھی اُن کی پہنچ سے باہر نہیں معلوم ہوتے اور وہ ہر رنگ، رُوپ اور ہر موضوع پر اِس طرح نکتہ رسی اور جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے پیش کر دیتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جزئیات نگاری ہی اُن کا سب سے بڑا شاعرانہ امتیاز ہے۔

12.07 نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری

نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے اُٹھے تھے اور اُنہی کے دُکھ درد، ہنسی خوشی، اَفکار و تاثرات میں شریک رہے۔ اگرچہ نظیر کے موضوعات بدلتے رہے لیکن ہر حالت میں ایک طرح کی صداقت اُن کی شاعری میں نمایاں ہوتی رہی۔ اُن کا انسانی ہم دردی کا مسلک کبھی نہیں بدلا۔ اُنہوں نے زندگی سے کبھی اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ اُنہوں نے عوام کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ عوام کی زندگی ویسے تو دُکھ درد کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن اپنی بنیاد میں بڑی طاقت رکھتی ہے۔ سلطنت تباہ ہوتی ہے۔ خاندان بدلتے ہیں لیکن عوام اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں، وہ مایوسی کا شکار نہیں ہوتے، نظیر نے اُنہی کی امیدوں سے اپنی شاعری کا چراغ روشن کیا ہے۔

نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے تو عوام نے نظیر کو زندہ رکھا۔ اُن کے موضوعات کی فہرست ہی اس بات کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے کہ نظیر انسان اور انسانی متعلقات میں سے اُن معمولی چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے جنہیں بڑے بڑے شعرا دیکھتے ہی نہ تھے یا محسوس ہی نہ کرتے تھے بلکہ اُن پر لکھنا شاعری کے جوہر کو غلط استعمال کرنے کے برابر جانتے تھے۔ آٹا، دال، پیسہ، کوڑی، جھونپڑا، تلاشِ زر، ہولی، مفلسی، روٹی، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں نظیر کا پسندیدہ موضوع تھیں۔ کیوں کہ نظیر غریبوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ مسلمانوں کے عرسوں اور ہندوؤں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ عید اور شبِ برات کے ساتھ ساتھ ہولی اور دیوالی سے بھی ایک سچے ھندوستانی کی طرح لطف اُٹھاتے تھے۔ اگر اُنہوں نے حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سلیم چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو ہندوؤں کے بڑے بزرگوں کی تعریف بھی کی۔ وہ عوام کو کسی بھی حالت میں نہیں بھولتے تھے۔

نظیر کی شاعری میں انسان ایک زندہ اور متحرک احساس اور مادی اسباب سے مسرور ہو جانے والی مخلوق کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ''آدمی نامہ'' میں اُنہوں نے مفلس عوام کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے جہاں ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے۔۔ انسان کی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوق اور پستی کا سر جھکتا ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوا ہے وہ ''آدمی'' ہے۔ اِس احساس کی تفسیر نظیر کے خیالات سے ہوتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے ''آدمی نامہ'' میں نظیر نے اپنے خالص بیانیہ انداز میں طرح طرح سے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اشراف اور کمینے سے لے کر بادشاہ اور وزیر تک ہر شخص ''آدمی'' ہے۔ 'آدمی نامہ'' کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے:

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زَردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دُکانیں لگا لگا اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو، کوئی کہتا ہے لا رے لا کس کس طرح کی بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' اُردو شاعری کا ایک ایسا منشور ہے جو نوعِ انسانی کی تعمیر و ترقی کے لئے اور بنی آدم کی محبت کے عالم گیر تصور کی رُو سے بڑی ہمہ گیر ہے۔ بیش تر اَقدارِ حیات مُرورِ اَیام کے ساتھ ساتھ بدل سکتی ہیں لیکن محبت اور ہم دَردی کے انسانی جذبات میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ ناسازگار حالات میں یہ جذبات عارضی طور پر دَب تو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے کچلے نہیں جا سکتے۔ جب تک صفحۂ روزگار پر آدمی کا وجود باقی ہے، بنی آدم کی معاشرت قائم و برقرار رہے گی۔

نظیر کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت اُس کا مقامی رنگ ہے۔ نظیر اکبر آبادی خالص عوامی شاعر تھے اور اُنہوں نے عوام کی دل چسپیوں میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ اُن کی نظموں میں صحیح معنوں میں ایک ایسے شخص کی رُوح نظر آتی ہے جو گہرے طور پر عوامی رنگ کا قائل ہے۔ یہ رنگ مختلف نظموں میں نمودار ہوا ہے۔ جن میں رنگ و نسل اور مذہب کی کوئی تمیز نہیں۔ نظیر غیر متعصب انسان تھے۔ اُنہیں کسی قسم کا تعصب چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ اُنہوں نے بہ یک وقت مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے تہواروں پر نظمیں لکھی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی تہوار ''شبِ برات'' پر اُن کی نظم دیکھیے جس میں تفریح کے تمام سامان نظر آتے ہیں:

کیونکر کرے نہ اپنی نمودار شب برات چلپک، چپاتی، حلوے سے ہے بھاری شب برات
زندوں کی ہے زباں کی مزے دار شب برات مُردوں کی روح کی ہے مددگار شب برات
لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برات

دنیا کی دولت میں جو زَردار ہیں بڑے قندوں کے حلوے، روغنی نانیں لیے گھڑے
پہنچاتے خوان پھرتے ہیں نوکر کئی پڑے زندہ بھی راہ تکتے ہیں، مُردے بھی ہیں کھڑے
اِن خوبیوں کی رکھتی ہے تیاری شب برات

آ کر کسی کے سر پہ چھپھوندر لگی کڑی اُوپر سے اور ہوائی کی آ کر پڑی چھڑی
ہوگئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم تڑی
کرتی ہے پھر تو ایسی ہی ستم گاری شب برات

نظیر کے فن کا کمال یہی ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو اِس طرح پیش کرتے ہیں کہ مرقع تیار ہو جاتا ہے جس مرقع میں اُن کی بنائی ہوئی جزئیات صاف نظر آتی ہیں، تصویر روشن، صاف اور واضح ہوتی ہے اور اُس تصویر میں ہر جگہ نظیر کی منظر کشی کا کمال نظر آتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری دل آویز نظاروں اور قدرتی مناظر کی تصویریں ہے جن میں سے بیش تر موسمِ برسات سے متعلق ہیں۔ یہ وہ سہانا موسم ہے جس میں حیاتِ انسانی میں اُبھار ہوتا ہے اور زندگی بے کیف معمولات کے خول سے نکل کر آزادی اور حسرت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کی ایسی جیتی جاگتی اور رنگین تصویریں اُس دور کے شعرا کی شاعری میں آپ کو کہیں اور نظر نہیں آئیں گی۔

نظیر اکبر آبادی مکمل طور پر ''عوامی شاعر'' ہیں اور اُن کی نظمیں روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اُن نظموں میں مذہبی اور سماجی تہواروں کے حوالے سے بھی بہت کچھ ملتا ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی ملتی ہیں جن میں عام آدمی کو ہنستے ہوئے، گاتے ہوئے اور کھیلتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے موسموں کے بارے میں بھی لکھا ہے اور ایسے موضوعات پر لکھا ہے جن پر اُن سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا جیسے روپیہ، روٹی، آٹا، دال اور پنکھا وغیرہ۔ اُنہوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ہر آدمی کو اُس کے مزاج کی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ''آگرے کی ککڑی'' کے دو بند دیکھیے:

کیا پیاری پیاری، میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں گنّے کی پوریاں ہیں، ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں مجنوں کی سَرد آہیں، لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اِس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اَسکندرے کی ککڑی

میٹھی ہے جس کو بَرفی کہیے، گلابی کہیے یا حلقے دیکھ اِس کو تازہ جلیبی کہیے
تِل شکریوں کی پھانکیں اب یا اِمرتی کہیے سچ پوچھیے یو اِس کو دَندانِ مصری کہیے
کیا خوب نرم و نازک اِس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اَسکندرے کی ککڑی

نظیر اکبر آبادی کے ہم عصروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، شیخ قلندر بخش جرأتؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ اور غلام ہمدانی مصحفیؔ وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ جدید نظم کا سہرا الطاف حسین حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کے سَر پر سجتا ہے لیکن نظیر اکبر آبادی کو بجا طور پر ''اُردو نظم کا باپ'' سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اُن کا دَور پہلے کا ہے اور وہ اُردو نظم کے بنیاد گزار ہیں۔

12.08 خلاصہ

اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی جگہ ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اُردو کی کم و بیش تمام شعری ہیئتوں جیسے غزل، مثنوی اور رُباعی کے علاوہ نظم کی دیگر غیر مروجہ ہیئتوں جیسے ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

نظیر کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں اپنے معاشرے کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ تصویر پرست نہیں بلکہ حقیقت پسند شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجرباتِ زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ نظموں کے

پیکر میں ڈھالا ہے۔ایک ہندوستانی ہونے کے ناتے اُنہیں اپنے وطنِ عزیز سے بے پناہ محبت تھی۔وہ یہاں کی تہذیبی زندگی سے جذباتی طور پر وابستہ تھے۔وہ مذہبی جھگڑوں سے دُور تھے اور صلحِ کل کے قائل تھے۔اُنہوں نے فارسی اور عربی کے علاوہ اپنے دور کی دوسری مروجہ زبانوں اور بولیوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اُردو شاعری کے ذخیرہِ الفاظ کو بے حد وسیع کیا ہے۔

12.09 فرہنگ

اِبتذال	: اخلاقی پستی	سج دَھج	: بناؤ سنگار
اِشتراکیت	: اِشتراک کا مسلک	سوز	: جلانے والا
اِنتشار	: بدنظمی	عطیہ	: عطا، بخشش
بانک پن	: کجی	فالج	: وہ بیماری جو آدھا یا پورا جسم بے کار کر دیتی ہے
بے ثباتی	: ناپائیداری	فروتنی	: عاجزی
بھانڈ	: جوکر، مسخرہ	فقر و فاقہ	: غریبی اور بھوک
پاس	: لحاظ	قلندرانہ	: درویش کی مانند
پاک باز	: بے گناہ	قناعت	: جو کچھ ملے اُس پر صبر کرنے کی عادت
پیشہ	: کاروبار	متحرک	: حرکت کرنے والا
جامہ زیبی	: دل کشی	متداول	: رائج
حلم	: برداشت کرنا	مثبت	: دُرست، صحیح، اچھا
خشتِ اول	: پہلی اینٹ	مشترکہ	: ساجھے کا
خلفشار	: پیچ و تاب	مشرب	: مسلک
خیال آرائی	: سوچنے کا عمل	مظہر	: ظاہر ہونے کی جگہ
داغ بیل	: بنیاد	وسیع النظری	: بلند خیالی
دستاویز	: اہم تحریر جو حوالے کے لئے مفید ہو	ہٹیلا	: ضدی

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ : نظیر اکبر آبادی نے اُردو شاعری کی کون کون سی اصناف پر طبع آزمائی کی؟

سوال نمبر۳ : نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں منظر نگاری کی نشان دہی کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ رسطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی کسی ایک نظم کی اپنے الفاظ میں تشریح کیجیے۔

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی لسانی خوبیوں کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) شیخ محمد اقبال (ب) شیخ ولی محمد (ج) شیخ علی وجودی (د) شیخ رشید

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی پیدائش کب ہوئی؟

(الف) ۱۷۳۵ء (ب) ۱۷۶۵ء (ج) ۱۷۵۵ء (د) ۱۷۴۵ء

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کتنے سال کی عمر میں دہلی سے اکبرآباد گئے؟؟

(الف) ۱۹/سال (ب) ۲۰/سال (ج) ۲۳-۲۲/سال (د) ۲۶/سال

سوال نمبر۴ : نظیر اکبرآبادی کس تاجر کے بیٹوں کو فارسی پڑھاتے تھے؟

(الف) لالہ لاجپت رائے (ب) لالہ موہن رائے (ج) نوبت رائے (د) لالہ بلاس رائے

سوال نمبر۵ : نظیر اکبرآبادی کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) شیخ محمد عادل (ب) شیخ محمد فاروق (ج) غلام حسین (د) صابر رضا

سوال نمبر۶ : پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ''زندگانیِ بے نظیر'' کب مرتب کی؟

(الف) ۱۷۶۵ء (ب) ۱۸۹۶ء (ج) ۱۹۴۷ء (د) ۱۸۸۶ء

سوال نمبر۷ : نظیر اکبرآبادی کا پہلا دیوان دیوناگری رسم الخط میں کب شائع ہوا؟

(الف) ۱۸۲۹ء (ب) ۱۹۲۴ء (ج) ۱۸۲۰ء (د) ۱۹۲۵ء

سوال نمبر۸ : میر قطب الدین باطنؔ کس شاعر کے شاگرد تھے؟

(الف) نظیر اکبرآبادی (ب) میر تقی میرؔ (ج) حیدر علی آتشؔ (د) قلندر بخش جرأتؔ

سوال نمبر۹ : ''آدمی نامہ'' کس شاعر کی مشہور نظم ہے؟

(الف) نظیر اکبرآبادی (ب) میر سوزؔ (ج) مرزا غالبؔ (د) داغؔ دہلوی

سوال نمبر۱۰ : اِن میں سے کون سی نظم نظیر اکبرآبادی کی ہے؟

(الف) فرشتہ (ب) پری کا سراپا (ج) گل بہ داماں (د) نو بہ نو

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) شیخ ولی محمد
جواب نمبر۲ : (الف) ۱۷۳۵ء
جواب نمبر۳ : (ج) ۲۳-۲۲ رسال
جواب نمبر۴ : (د) لالہ بلاس رائے
جواب نمبر۵ : (ب) شیخ محمد فاروق
جواب نمبر۶ : (ب) ۱۸۹۶ء
جواب نمبر۷ : (ج) ۱۸۲۰ء
جواب نمبر۸ : (الف) نظیر اکبرآبادی
جواب نمبر۹ : (الف) نظیر اکبرآبادی
جواب نمبر۱۰ : (ب) پری کا سراپا

12.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ از سید احتشام حسین
۲۔ نظیر اکبرآبادی، اُن کا عہد اور شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۳۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ از سید طلعت حسین نقوی
۴۔ نظیر اکبرآبادی از اَمیر حسن نورانی
۵۔ نظیر نامہ از مخمور اکبرآبادی
۶۔ کلیاتِ نظیر اکبرآبادی از نظیر اکبرآبادی
۷۔ دیوانِ نظیر اکبرآبادی از مرزا فرحت اللہ بیگ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

BAUL (N) - 220-1(004120)